قرۃ العین خرم ہاشمی
زندگی خاک نہ تھی
WWW.PAKSOCIETY.COM

مکمل ناول

قرۃ العین خرم ہاشمی

بند شیشوں کے پرے دیکھ
دریچوں کے ادھر
سبز پیڑوں پہ
گھنی شاخوں پہ، پھولوں پہ
وہاں کیسے چپ چاپ برستا ہے مسلسل پانی....!
کتنی آوازیں ہیں
یہ لوگ ہیں
باتیں ہیں مگر!
ذہن کے پیچھے
کسی اور سطح پہ
کہیں جیسے چپ چاپ
برستا ہے تصور تیرا....!!!

شیشے کے پار برستی بارش اور بارش کی رم جھم سے بجتے فطرت کے راگ کو سنتی، محسوس کرتی وہ کسی اور ہی جہاں میں پہنچی ہوئی تھی! اس خوب صورت سے پہاڑی علاقے میں فطرت کے جلوے اور رنگینی جگہ جگہ نظر آتی تھی۔ دنیا کے شور شرابے اور ہنگاموں سے جب بھی اس کا دل اکتا جاتا وہ چند دن، اس علاقے میں موجود اپنے ریسٹ ہاؤس میں چلی آتی تھی۔ یہاں آکر اسے ایسے لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے ظاہری وجود کو چھوڑ کر، اپنے ''اصل'' میں لوٹ آئی ہے۔ اس کا وہ ظاہری وجود، جو دنیا کے لیے تھا۔

شیشے کے پار بھیگتے درختوں کو دیکھتی، شال کو اپنے گرد ٹھیک سے لپیٹتی۔

وہ پلٹ کر بیڈ تک آئی سائیڈ ٹیبل پہ پڑے اپنے موبائل کو اٹھایا۔ ہمدان کی پانچ مس کالز تھیں۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے جلدی سے میسجز ٹائپ کیا اور اسے میسجز سینڈ کر کے موبائل آف کیا اور لاپروائی سے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں پھینک کر، کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنی خیریت کی اطلاع اس نے پہنچا دی تھی، باقی کی معلومات وہ ریسٹ ہاؤس کے ملازموں سے بھی لے سکتا تھا۔ اپنی اس تنہائی میں وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی تھی یہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اور ٹیرس پہ تنہا کھڑی، بارش کی بوندوں کو گنتی وہ لڑکی خود بھی اسی خاموشی اور تنہا منظر کا پس منظر لگ رہی تھی!

''السلام علیکم بابا جان!'' رحیمہ بی بی کے ساتھ مل کر میز پہ ناشتے کے لوازمات رکھتی انوشے نے ہشاش بشاش لہجے میں بابا جان کو سلام کیا۔ بابا جان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ پنک ہائی نیک والے سوئیٹر پہ اسکن کلر کی شال لیے بالوں کو کیچر میں مقید کیے، جس کی وجہ سے چہرے کے اطراف میں کچھ لٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ جسے وہ کان کے پیچھے کر لیتی اور مگن سے انداز میں بابا جان کو ناشتے کے لوازمات پیش کر رہی تھی۔

''رحیمہ بی بی آپ گرم چائے لے آئیں۔'' انوشے نے رحیمہ بی بی سے کہا جو سر ہلاتی ہوئی واپس کچن میں چلی گئیں رحیمہ بی بی ان کی خاندانی ملازمہ تھیں۔ جسے انوشے اپنے بچپن سے اس گھر میں دیکھتی آرہی تھی۔

''تم نے اس بار کافی دن نہیں لگا دیے ایبٹ آباد میں۔'' بابا جان نے ناشتا کرتے ہوئے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا تھا۔ مگر وہ بے چینی سے اس کے جواب کے منتظر تھے۔ پچھلے کافی دنوں سے انوشے بہت الجھی الجھی اور گم صم سی لگتی تھی۔ انوشے کی چوبیس سالہ زندگی کے شب و روز ان کے سامنے تھے، جو ایک

کھلی کتاب کی طرح کے تھے' مگر نجانے کیوں اب کھوئی کھوئی سی وہ انوشے انہیں ایک پہیلی کی طرح سے لگنے لگی تھی! جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ سلائس پہ مکھن لگاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کے ہاتھ رکے تھے مگر سر جھٹک کر خود کو مگن ظاہر کرتے ہوئے' اس نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔

"جی بابا جان! بس ویسے ہی دل چاہ رہا تھا کچھ دن دنیا کے ہنگاموں سے دور' اکیلے میں وقت گزارنے کا یونیورسٹی سے بھی فارغ تھی اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ دن تنہا اپنے ساتھ بھی گزارے جائیں۔"

کراچی

انوشے نے روانی میں کہا تو بابا جان نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنی والی پر اعتماد اور ذہین انوشے 'اب ادھر ادھر دیکھتی' نظریں چراتی رہتی تھی۔ جیسے اس کی شفاف ٹھہرے پانی جیسی' سبز رنگ کی آنکھیں وہ راز افشانہ کردیں جن پہ گھری پلکوں کا حسین پہرہ تھا۔ انوشے کی آنکھوں کی رنگت بابا جان کی آنکھوں جیسی تھی۔

"ہوں! تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ جو وقت تم یہاں میرے ساتھ گزارتی ہو' اس میں تم "اپنے" ساتھ نہیں ہوتیں؟ کیا یہ سب دکھاوے کی زندگی ہے انوشے؟ کیا تم خوش نہیں ہو میرے ساتھ؟"

بابا جان نے دل میں اتنے دنوں سے مچلتا سوال' زبان کے حوالے کر ہی دیا۔

"نہیں بابا جان!" انوشے نے تڑپ کر ان کے سبز اور نیلی رگوں والے سفید اور مضبوط مردانہ ہاتھ پہ اپنا نازک سا ہاتھ رکھا۔

"آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ جتنی محبت اور پیار سے آپ نے میری پرورش کی ہے میں اگر چاہوں بھی تو آپ کا حق نہیں ادا کر سکتی۔" انوشے نے نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ کہا تو بابا جان اسے خاموشی سے دیکھ کر رہ گئے۔ ہر دم ہنسنے' مسکرانے والی انوشے کی آنکھیں اب بات بے بات نم ہو جاتی تھیں۔ جیسے دل کا پیالہ آنسوؤں کے نمکین پانی سے بھرا ہوا تھا جو ہلکی سی ٹھیس لگنے پہ چھلک پڑتا تھا اور آنکھیں...! جو اندر کے حال کا آئینہ ہوتی ہیں یہ آنکھیں راز کب رکھتی ہیں بھلا! کبھی اداسی کی صورت' کبھی نمی کا جال لیے' کبھی جاگتی راتوں کا ہلکا گلابی پن' سب راز کھول دیتی ہیں! اور ہم تیزی سے پلکیں جھپکاتے یا ادھر ادھر دیکھتے' نظریں چھپاتے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک دیوار کے پیچھے چھپ گئے ہیں۔

"اچھا خیر چھوڑو ان سب باتوں کو۔ بڑی آپا کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انوشے بہت اصرار کرنے پر بھی صرف دو دن ان کی طرف ٹھہری تھی! تمہاری بہت فکر کر رہی تھیں کہ بہت کمزور اور چپ چپ سی ہو گئی ہو۔"

بابا جان نے ایبٹ آباد میں مقیم اپنی بڑی بہن کنیز فاطمہ کے فون کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"جی بابا جان! بڑی پھوپھو سچ میں بہت پیار کرتی ہیں مجھ سے۔ دو دنوں میں ہی انہوں نے اتنا کچھ اپنے ہاتھوں سے خاص میرے لیے بنا بنا کر کھلایا کہ میری تو بس ہو گئی تھی۔"

انوشے نے تصور کی آنکھ سے بڑی پھوپھو کے گھر میں گزارے خوشگوار دنوں کو دیکھتے ہوئے ہنس کر بتایا تو بابا جان بھی مسکرا دیے۔

"ہاں وہ شروع سے ہی ایسی ہی ہیں۔ سب کا بہت خیال رکھنے والی اور فکر کرنے والی۔" بابا جان نے مسکراتے ہوئے' بہت محبت سے اپنی بہن کا ذکر کیا۔

"اب گل پھوپھو شکوہ کر رہی تھیں کہ میرے پاس لاہور بھی رہنے آؤ۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ میں اپنے بابا جان کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آسکتی۔ ہاں اگر بابا جان خود کسی دن مجھے اپنے ساتھ لاہور لے چلیں تو پھر اور بات ہوگی۔"

انوشے نے شرارت سے کہتے' بال بابا جان کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔ بابا جان اس کی بات سمجھ کر مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے لگے۔

"اسلام آباد سے لاہور کون سا دور ہے آج کل آفس میں کام زیادہ ہے۔ میں فری ہو جاؤں تو لاہور کا ایک چکر لگالیں گے۔"

بابا جان نے ذہن میں آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے کہا۔ تو انوشے ان کا دھیان بٹ جانے پہ شکر ادا کرتی۔ گرم گرم چائے کے سپ لینے لگی۔

مگر آخر کب تک؟ درد جب حد سے سوا ہو جائے گا تو چہرے کے خدوخال سے ہوتا لہجے میں بھی سما جائے گا۔ اور لہجوں کے درد' چھپائے نہیں چھپتے!

شہر کے مضافات سے دور بڑی سی' پرانے زمانے کی بنی حویلی' جس میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ' جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے تزئین و آرائش میں کافی

تبدیلی کی گئی تھی۔ آج کے دن بہت خوب صورتی سے سجی ہوئی تھی۔ آخر کیوں نہ ہوتی۔ اس حویلی کے اکلوتے بیٹے اور وارث کی آج شادی کی تقریب تھی۔ حویلی کے اندر باہر بہت شور اور گہما گہمی تھی۔ سجی سنوری بچیاں اپنے زمین کو چھوتے دوپٹوں کو سنبھالنے میں ہلکان ہوتیں، لہنگا پہنے، چوڑیوں سے ہاتھ بھرے، اندر سے باہر بھاگ رہی تھیں۔ لڑکیوں کی ٹولیاں الگ رنگ میں، جگہ جگہ براجمان تھیں۔ ہنسی، قہقہے لگاتیں، ہار و سنگھار کیے، ہر جوان دل کو دھڑکاتے، کہیں مہندی کے تھال سجا رہی ہوتیں کہیں پھولوں کے تھال لیے کھڑی ہوتیں۔

مردانہ اور زنانہ حصے الگ الگ تھے۔ اس لیے لڑکیاں بہت آرام سے، زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ حویلی میں بہت رونق تھی۔ کیوں کہ بے جی کے ننھیال اور ددھیال سے لوگ شادی میں شرکت کرنے آئے ہوئے تھے۔ سسرال میں سے زیادہ تر رشتہ دار آس پاس ہی رہتے تھے۔ ویسے بھی بے جی کی سسرال میں لمبے چوڑے رشتے نہیں تھے۔ ان کے شوہر عبدالرحیم اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ ساس سسر بہت شفیق اور مہربان تھے۔ جب تک زندہ رہے بے جی کے لاڈ اٹھاتے رہے۔

بے جی کو اللہ نے تین بچوں سے نوازا تھا۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ عبدالرحیم کی وفات تین سال پہلے قضائے الٰہی سے ہو گئی تھی۔ تب تک وہ بڑی دونوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ جہانگیر کے سر سہرا دیکھنے کی تمنا لیے وہ ابدی نیند سو چکے تھے۔ آج جہانگیر بھی اپنی زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر رہا تھا۔ جہاں بے جی کا دل خوشی سے معمور تھا وہاں آنکھوں میں نمی بھی تھی۔ دونوں بہنیں بھی ہر کام میں پیش پیش تھیں۔ کیوں نہ ہوتیں آج ان کا راج دلارا بھائی، دلہا بنا تھا۔ پریوں جیسی آن بان والی ماہ رخ کو بیاہنے کے لیے!

غرض مختلف رسموں سے ہوتیں، بالآخر دلہن کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے، بڑا سا گھونگھٹ نکالے، بھاری زیورات اور لہنگے میں ملبوس، ماہ رخ نے سرخ پتیوں پہ رکھے روشن دیے دیکھے۔ تو ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے خوب صورت لبوں کا احاطہ کیا۔ سیڑھیوں سے لے کر، اس کے کمرے تک کا راستہ بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ اسے اپنے دل میں بھی ایسے ہی رنگ کے سرخ پتیوں کی بارش ہوتی نظر آ رہی تھی اور امنگوں اور امیدوں کے جلتے ننھے ننھے بے شمار دیے جن کی لو اس کے گالوں کو دہکا رہی تھی۔

خسرو رین سہاگ کی، سو جاگی پی کے سنگ
تن مورا من پریتم کا، دونوں ایک ہی رنگ!

خوب صورتی اور نفاست سے آراستہ کمرے میں، پھولوں سے سجی سیج پہ بیٹھی، اپنے مہندی سے رچے نم ہاتھوں کی لرزش کو چھپاتی، دھڑکتے دل سے وہ اپنے ہم سفر کی منتظر تھی! ہم سفر بھی وہ، جس کی ایک جھلک نے ہی اسے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ جہانگیر کی خاندانی شرافت، نام اور اس کی قابلیت کے علاوہ، اس کی سحر زدہ کر دینے والی شخصیت نے بھی ماہ رخ کو اس رشتے پہ اثبات کی مہر لگانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ ماہ رخ کا حسن بھی لفظوں کا محتاج نہیں تھا۔ مگر اس کے حسن میں اضافہ اس کی خود سے بے نیازی اور سادگی سے ہوتا تھا۔ دروازہ کھولنے کی ہلکی سی آواز نے کائنات کی ہر چیز کو ساکت کر دیا تھا۔ بس وہ تھی اور اس کے دل کا بڑھتا ہوا شور تھا۔

تیری ہر چاپ سے جلتے خیالوں میں چراغ
جب بھی تو آئے جگاتا ہوا جادو آئے!

ماہ رخ کا سارا جسم سماعت بن گیا تھا۔ اس کی چاپ سے جلتے چراغوں کی روشنی خود میں دور تک اترتے محسوس کر رہی تھی۔ جب جہانگیر نے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے ایک دم ہی اس کا گھونگھٹ الٹ دیا تھا۔ ماہ رخ نے بے اختیار آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مگر اس کے پلکوں کی لرزش، اس کے دل کا حال بیان کر رہی تھی۔ جہانگیر نے ٹھٹک کر اس کے دو آتشہ حسن کو دیکھا

تھا۔ بے۔جی کا انتخاب لاجواب تھا۔ مگر وہ خود بھی کسی سے کم نہیں تھا اسی لیے اسے ہم سفر بھی ایسا ہی ملنا چاہیے تھا۔ یہ جہانگیر کی خود پسند سوچ تھی۔ جس نے لفظوں کا روپ دھار لیا تھا۔

"ماہ رخ تم خالصتاً" بے۔جی کی پسند ہو۔ مگر میرے دل تک آنے کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے۔ میری زندگی کے کچھ اصول ہیں۔ جن پہ میں نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا ہے اور میں تم سے بھی یہی امید رکھتا ہوں کہ ان سے ٹکرانے کے بجائے 'سمجھ داری سے اپنی زندگی میں شامل کر لو گی اور سب سے اہم بات .....!" جہانگیر نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی مرضی چلانے اور بحث کرنے والی عورتیں سخت ناپسند ہیں۔ امید ہے کہ تمہیں میری بات سمجھ آ گئی ہوگی۔ رات کافی ہو چکی ہے تم چینج کر لو۔" جہانگیر نے اپنی شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے کچھ یاد آنے پہ پیچھے مڑ کر گم صم سی بیٹھی ماہ رخ کو دیکھا۔

"اور ہاں یاد آیا۔ تمہارا منہ دکھائی کا گفٹ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں پڑا ہوا ہے امید ہے تمہیں پسند آئے گا۔ ویسے بے جی کی پسند کو تم ریجیکٹ کر ہی نہیں سکتیں۔"

ماہ رخ نے نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ واش روم کے بند ہوتے دروازے کو دیکھا تھا۔ کیسی زور کی ہوا چلی تھی کہ سارے چراغ ہی بجھا گئی تھی۔ سہاگ رات 'ارمانوں سے سجی 'محبت کے چند بولوں کا رس 'سماعت سننے کو بے چین تھی۔ ماہ رخ نے بیڈ سے نیچے پاؤں رکھے تو زیور کی جھنکار سے مدھر سر بکھر گیا۔ اس کا یہ حسن 'اس کا دلستاپے کا روپ 'ہار سنگھار کچھ بھی تو ایسا نہیں تھا 'جسے سراہا گیا ہو۔ جس کے لیے اتنے جتن کیے تھے اگر وہ ہی دل نوازی کی ایک نظر ہی نہ ڈالے تو کیا فائدہ اس ہار سنگھار کا! اس روپ کا.....!

بے دلی سے ایک ایک زیور کو اتارتی 'ماہ رخ نم آنکھوں سے 'اپنے دل کو تسلی کے بول کہتی 'اندر ہی اندر خود سے الجھ رہی تھی۔

"ایک ایسا ہم سفر جس کی ہر بات میں سے شروع ہو کر میں پہ ہی ختم ہوتی ہے۔ جو نازک جذبوں کی پذیرائی کرنے سے قطعی نا آشنا ہے اس کے ساتھ چلنا کتنا مشکل ہوگا۔"

ماہ رخ نے گہری سانس لے کر خود کو ان سوچوں سے آزاد کرنا چاہا اور لہنگا سنبھالتی ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے نازک جذبات واحساسات کے شیشے پہ ابھی ایسی سرد رویوں کی بہت سی کنکریاں پڑنی تھیں۔ جہانگیر علی شاہ پتھر کا ایسا بت تھا جو صرف زخم دینا جانتا تھا مرہم لگانا نہیں۔

آج صبح سے ہی بہت اچھی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ بابا جان کے آفس جانے کے بعد 'انوشے 'دھوپ کا مزا لینے لان میں چلی آئی۔ اور بہت غور سے گھوم پھر کے لان کا جائزہ لینے لگی۔

"مالی بابا ٹھیک سے لان کا خیال نہیں رکھ رہے ہیں۔ آج بات کروں گی ان سے۔ کتنے ہی پودوں کو کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے اور یہ گھاس اس طرف سے بڑی ہوئی ہے اور....."

انوشے خود کلامی کرتے ہوئے پودوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خود کو کسی سوچ یا خیال سے بچانے کے لیے 'یہ کوشش کر رہی ہے۔ کچھ دیر میں سہی بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی اور پوری طرح سے اپنے کام میں مگن ہو کر اردگرد کی ہوش بھلا بیٹھی تھی۔

فطرت ایسے ہی خود میں گم کر کے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی مگر ہمیں بے معنی کی سوچوں اور الجھنوں سے آزاد کر کے 'نئی امید اور امنگ دیتی ہے۔ جیسے کہ انوشے خود کو اس وقت تر و تازہ اور آزاد محسوس کر رہی تھی اندر اس سکون کی تلاش میں ہی وہ 'اتنے دن اس پہاڑی علاقے کے ریسٹ ہاؤس میں گزار کر آئی تھی۔

"انوشے بی بی! آپ کا فون ہے۔" گھریلو ملازم اکبر نے کارڈلیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ تو گوڈی کرتی انوشے نے چونک کر اس کے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا اور پھر مٹی سے بھرے اپنے

ہاتھوں پہ نظر ڈالی۔ ہاتھ جھاڑتی اس نے کارڈلیس پکڑ لیا۔

"کہاں غائب ہو بے وفا لڑکی!" انوشے کے ہیلو کہنے پہ دوسری طرف سے بے ساختہ شکوہ کیا گیا۔ انوشے کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں تو یہاں ہی ہوتی ہوں مگر سنا ہے آپ ہمارے شہر میں آکر بھی ہم سے نہیں ملے ہیں؟" انوشے نے جواباً شکوہ کیا تو ہمدان بے ساختہ ہنس پڑا۔

"بالکل تمہاری طرح سے جیسے تم ایبٹ آباد آکر ہمارے پاس رکنے کے بجائے 'اس ویرانے میں آباد ریسٹ ہاؤس میں ڈیرا ڈال لیتی ہو اور سارا دن بھٹکتی آتما کی طرح 'اونچے نیچے راستوں پہ چہل قدمی کرتی مقامی لوگوں کو ڈراتی رہتی ہو۔"

"کافی تیز سورس آف انفارمیشن ہیں جناب کے!" انوشے نے ہمدان کی بات پہ ہنستے ہوئے کہا اور لان چیئر پہ بیٹھ گئی۔

"بس جو دل کے قریب ہوں ان کے ہر پل کی خبر رکھنی بھی پڑتی ہے۔" ہمدان نے ٹریک سے اترتے ہوئے کہا۔ اسی پوائنٹ پہ آکر انوشے خود میں سمٹ جاتی تھی۔ ابھی بھی ہمدان کو ٹریک سے اترتے دیکھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ جسے سمجھ کر ہمدان گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"اچھا! میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ بابدولت آج رات کا کھانا آپ کے گھر تناول فرمائیں گے۔ ہماری پسند کی تمام ڈشز تیار ہونی چاہییں۔ حکم عدولی پہ کنیز کو دیوار میں چنوایا بھی جاسکتا ہے۔" ہمدان نے تحکمانہ لہجے میں شرارت سے کہا۔

"جی جی جو حکم جناب عالی! بس اتنا بتادیں کہ یہ کنیز کون ہے جس تک آپ کا حکم بمعہ فرمائشی لسٹ کے پہنچانا ہے۔"

انوشے نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ جواباً" ہمدان نے کچھ کہا تو انوشے کی بدھر ہنسی فضا میں بکھر گئی۔ فون بند کر کے کارڈلیس پہ ٹھوڑی رکھ کر کچھ سوچتے ہوئے 'اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ ہلکی سی گنگناہٹ لیے' وہ اٹھ کر اندر کی طرف چل پڑی۔ رحیمہ بی بی کے ساتھ مل کر اسے شام کے ڈنر کی اچھی سی تیاری بھی کرنی تھی۔ آج کی شام کو وہ بہت اچھی طرح سے اور یادگار بنانا چاہتی تھی۔ جیسے آج سے دو سال پہلے کی ہوا کرتی تھیں۔ بے فکری اور خوشی کے رنگوں سے مزین!

☼ ☼ ☼

"جہانگیر! ادھر آؤ بیٹا!" بے جی نے گھر سے باہر جاتے جہانگیر کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ شام کا وقت تھا۔ بے جی بڑے سے صحن میں تخت پہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ سردیوں کے شروع ہوتے ہی یہ بڑا سا صحن آباد ہو جاتا تھا۔ جہاں سورج کی نرم گرم شعاعوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گھر کے بہت سے کام بھی نپٹائے جاتے تھے۔ ابھی بھی بے جی عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے جہانگیر کو تیار ہو کر پورچ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

جہانگیر نے پاس آکر بے جی کو سلام کیا تو انہوں نے اس کے جھکے سر پہ پیار دے کر 'اشارے سے اپنے پاس بیٹھنے کا کہا۔ "حکم کریں بے جی!" جہانگیر نے مودب ہو کر پوچھا۔

"جہانگیر بیٹا! تمہاری شادی کو دو مہینے ہونے والے ہیں ماہ رخ بیٹی بہت اچھی اور دھیمی مزاج کی بچی ہے۔ مگر بیٹا میں نے بہت بار نوٹ کیا ہے کہ تمہارا رویہ اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سخت ہے۔ شادی کے بعد سے اب تک تم اسے کہیں بھی گھمانے پھرانے نہیں لے کر گئے اور تو اور تم نے اس کے خاندان کی طرف سے دی جانے والی دعوتوں پہ بھی جانے سے منع کر دیا۔ سوائے چند ایک کے!" بے جی نے سنجیدگی سے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

جہانگیر خاموشی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔ ماں کے چہرے پہ پھیلی ناراضی صاف نظر آرہی تھی۔ اسی وقت خوب صورت سے میرون شال اوڑھے 'جس پہ کڑھائی ہوئی تھی' سج سج کے قدم اٹھاتی ماہ رخ بھی

چائے کی ٹرے اٹھائے چلی آئی' ماہ رخ پہ کاموں کی ذمہ داری نہیں تھی مگر اکثر صبح کا ناشتا اور شام کی چائے' وہ خود بے جی کو بنا کر دیتی تھی۔ جس پہ بے جی بہت خوش ہوتی تھیں اور اسے ڈھیروں دعاؤں سے نوازتی تھیں۔
ماہ رخ نے پاس آکر سلام کیا اور پاس پڑی میز پہ ٹرے رکھ کر چائے بنانے لگی۔
"آپ چائے لیں گے؟" ماہ رخ نے ذرا کی پلکیں اٹھا کر اپنے مجازی خدا سے سوال کیا۔ جس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔
"اچھا تو یہ محترمہ اس معمولی خدمت کے عوض آپ کے کان بھرتی ہیں میرے خلاف!" جہانگیر علی شاہ نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تو ماہ رخ چائے میں چینی ڈالنا بھول کر' حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔
"جہانگیر' یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟ وہ تمہاری بیوی ہے۔ آج کل تو لوگ نوکروں سے بھی ایسے بات نہیں کرتے ہیں' کیا میری تربیت یہ تھی! تم نے مجھے اندھا یا بے وقوف سمجھ کر رکھا ہوا ہے جو میں تمہارے رویے کو دیکھ یا محسوس نہیں کر سکتی ہوں۔"
بے جی نے جلال میں آتے ہوئے کہا تو جہانگیر غصے کو ضبط کرتا' ہونٹ چباتا' ایک دم سے وہاں سے اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ لیتا' چلا گیا۔ پیچھے ماہ رخ آنکھوں میں آنسو لیے' حیرت کی تصویر بنے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ جبکہ بے جی تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ انہیں نہیں پتا چلا کہ کب ماہ رخ خاموشی سے اٹھی اور اندر چلی گئی تھی۔ اس رات جہانگیر علی شاہ بہت دیر سے گھر آیا تھا۔ اور لان میں موجود' سیاہ چادر جس پہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے شیشے ٹانکے ہوئے تھے' لیے وجود کو اپنے انتظار میں جاگتا دیکھ کر ایک لمحے کو ان کے قدم رکے ضرور تھے۔ مگر ٹھہرے نہیں تھے۔
اور ان کی چوڑی پشت پہ نظریں جمائے' اندر جاتا دیکھ کر' اس نے گہری سانس لی تھی۔ اور تھک ہار کر سنگی بینچ پہ بیٹھ گئی تھی۔ یہ دو مہینے' دو صدیوں کے برابر تھے اس کے لیے۔ وہ ہر لمحہ' ہر پل' پتھر کے بت کو خوش کرنے' راضی کرنے میں لگی رہتی تھی مگر پھر بھی پتھر کا وہ مجسمہ پگھلتا نہیں تھا۔ ماہ رخ نے سیاہ رات کے دامن پہ پھیلے ستاروں کی طرف دیکھا۔
ہم؟

دوران خلاؤں میں
رقص کرتے رہتے ہیں
ان گنت ستارے ہیں!
اپنے اپنے محور میں
پھر بھی دست قدرت نے
چند اک ستاروں میں
اک کشش سی رکھ دی ہے
جب قریب آتے ہیں
ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں
ہم وہی ستارے ہیں؟

اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کو سمیٹتے' ماہ رخ آہستگی سے اٹھی اور اندر کی طرف چل پڑی۔ جو بھی تھا حقوق و فرائض کا رشتہ تو دونوں کو ہی نبھانا ہی تھا۔ ہاں اس میں دل کا زیاں اور بکھرنا کس نے دیکھنا تھا اور دل بھی نازک سے جذبات و احساسات رکھنے والی موم کی گڑیا کا.....! جو رویوں کی تپش میں لمحہ بہ لمحہ پگھل رہی تھی!

☼ ☼ ☼

"کیسی ہو؟" میسج ٹون بجی تو اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اسی دشمن جان کا پیغام آیا تھا۔ دل میں درد سا پھیلنے لگا تھا۔
"پتا نہیں! سوچنا چھوڑ دیا ہے!" جواب حسب روایت ہی بھیجا تھا اس نے۔
"بہت یاد آتی ہو! کیا کروں میں؟" بہت بے چارگی سے کہتے' آخر میں معصومیت سے سوال کیا گیا تھا۔
"تمہیں بار بار کہا ہے میرے راستے میں مت آؤ! مجھے جینے دو میری زندگی۔"
بے بسی سے وہ چیخ پڑی تھی۔
"تم راستہ نہیں! منزل ہو میری اور میری جان!"

"کچھ منزلوں پر
قدم نہیں....
دل پہنچتے ہیں....!"

بڑے جذبے سے میسجز کیا گیا تھا۔ اس کے گال دہک اٹھے تھے۔ خوب صورت لبوں کو کچلتے اس نے بے بسی سے صرف اتنا لکھا تھا۔

"تم....!" اور میسجز سینڈ کرکے 'موبائل آف کرکے رکھ دیا۔ تکیے میں منہ چھپائے' وہ اس کے لفظوں کے سحر اور وجود کے جادو سے بچنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہوتے ایک دم سے رو پڑی تھی۔

اور اس کے ادھورے میسجز سے وہ جان چکا تھا کہ وہ بے بسی کی انتہا پہ تھی۔ اس کے لبوں پہ خوب صورت مسکراہٹ پھیل گئی تھی! "جتنا بھی دور بھاگ لو سوا بس میرے پاس ہی آنا ہے تمہیں!"

اس کے تصور سے مخاطب ہوتے دھیرے سے خود کلامی کی تھی اس نے۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تو مما سے پہلے ہی کہہ دیا تھا جیسے ہی امتحان ختم ہوں گے میں ایک دن بھی ضائع کیے بغیر ماموں جان کے پاس رہنے چلی جاؤں گی اور ان کی خوب خدمت کروں گی تاکہ وہ بھی ایک سگھڑ اور سلیقہ شعار بیٹی کا سکھ لے سکیں۔ انوشے سے تو ایسی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔"

علشبہ کی نان اسٹاپ چلتی زبان 'انوشے کو چائے کی ٹرالی لاتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تھمی ضرور تھی مگر رکی نہیں تھی۔ مونگ پھلی سے انصاف کرتے وہ نیچے قالین پہ رکھے کشن پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس ہی صوفے پہ بابا جان ٹی وی کا والیوم بند کیے' بے حد دلچسپی اور اشتیاق سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"ویسے یہ سگھڑ اور سلیقہ مند بیٹی کا سکھ کل پھوپھو کو بھی ملنا چاہیے تھا نا! تمہیں چاہیے تھا کہ ان چھٹیوں میں تم کل پھوپھو کو مکمل آرام کرواتیں۔ مگر تمہیں سیر سپاٹے کرنے سے ہی فرصت نہیں ہے!"

انوشے نے گرم گرم گاجر کا حلوہ بابا جان اور علشبہ کو پیش کرتے ہوئے' علشبہ سے کہا تو وہ کھسیانی ہنسی ہنس پڑی۔

"تم مما کی فکر مت کرو۔ گھر میں نوکر بھی موجود ہیں اور سب سے بڑی بات' مما کی دو دو بہوئیں ہیں مما روایتی ساس بن کر ان سے خوب خدمت لیتی ہیں۔ مگر یہاں ماموں جان کو میری خدمت کی ضرورت تھی 'ہے نا ماموں جان؟"

علشبہ نے فراٹے بھرتے ہوئے بابا جان کو مخاطب کیا۔ جو اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے۔ مگر ان کے چہرے پہ پھیلی ہلکی سی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ انہیں علشبہ کا بولنا اچھا لگ رہا ہے۔

"شرم کرو لڑکی! اپنی ماں کو ہی ظالم ساس مشہور کر رہی ہو۔ کیا میں جانتی نہیں کہ کل پھوپھو کتنی اچھی اور سوفٹ نیچر کی ہیں۔"

"اچھا بچوں تم دونوں بیٹھو! مجھے کچھ کام کرنا ہے آفس کا۔ میں اسٹڈی روم میں ہوں۔ کچھ دیر میں ہمدان آئے گا۔ اسے وہاں ہی بھیج دینا۔"

بابا جان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ انوشے نے اثبات میں سر ہلا دیا جبکہ علشبہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ہمدان اکثر آتے ہیں ناماموں جان سے ملنے!"

"ہوں! ہمدان شروع سے ہی بابا جان سے کافی اٹیچڈ رہا ہے۔ اب تو خیر سے اسلام آباد میں ہی جاب کرتا ہے۔ تقریباً" روز ہی ملاقات ہو جاتی ہے ہمدان کی بابا جان سے۔"

انوشے نے اپنے سے دو سال چھوٹی 'ایم۔ اے پارٹ ون کی طالبہ اور نٹ کھٹ سی کزن علشبہ کو تفصیل سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

کل پھوپھو کے چار بچے تھے۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ علشبہ سے چھوٹا احمد سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ بڑے دو بھائی زوار اور احتشام شادی شدہ تھے۔ زوار بھائی کی بیوی آمنہ' بڑی پھوپھو کی بیٹی تھیں۔ زوار بھائی اور آمنہ کے دو بچے 'ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔

احتشام کی بیوی عائلہ ' خالصتاً" ان کی اپنی پسند تھیں۔ دونوں کی ایک بہت پیاری بیٹی تھی۔ علشبہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اکلوتی 'بیٹی' بہن اور پھوپھو بن کر اس کے مزے ہی مزے تھے۔

"میں نے سنا تھا کہ ماموں جان نے بہت زور دیا تھا ہمدان پہ کہ ان کے ساتھ 'اسی گھر میں آکر رہے جبکہ ہمدان نے یہاں آکر رہنے سے منع کر دیا تھا۔" علشبہ نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! بابا جان نے کافی زور دیا تھا۔ مگر وہ نہیں مانے ویسے آفس کی طرف سے انہیں اپارٹمنٹ ملا ہوا ہے۔" انوشے نے لاپروائی سے جواب دیا تو علشبہ کسی سوچ میں گم سرہلا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

ماہ رخ کے والد کا اس وقت انتقال ہوا جب ماہ رخ دس سال کی تھی۔ ماہ رخ سے بڑے دو بھائی تھے۔ احسن بھائی اور جنید۔ ماہ رخ کی والدہ ام کلثوم لاہور کے ایک کالج میں لیکچرار تھیں۔ بہت وضع دار اور باہمت خاتون جنہوں نے شوہر کے مرنے کے بعد بہت ہمت اور حوصلے سے وقت گزارا تھا۔ اپنے بچوں کی کڑی نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تربیت پہ بھی خاص توجہ دی تھی۔ بچے تینوں ہی ماں کے فرمابردار اور فطرتاً" نیک تھے۔ ماں کی انتھک محنت اور کوششوں کی دل سے قدر کرنے والے۔

ام کلثوم کا ایک ہی بھائی تھا۔ جو کافی عرصے سے اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا میں رہائش پذیر تھا۔ دونوں بہن بھائی دور ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مکمل رابطے میں رہتے تھے اور تبریز ماموں کی کوششوں سے ہی بی ایس سی کرنے کے بعد احسن بھائی کینیڈا چلے گئے۔ اور وہاں مزید تعلیم حاصل کرنے ساتھ ساتھ جاب بھی کرنے لگے اور گھر بھی پیسے بھیجنے لگے۔

جنید ایف ایس سی میں اور ماہ رخ میٹرک میں تھی۔ احسن کے باہر جانے سے گھر کے حالات پہلے سے بہت بہتر ہونے لگے تھے۔ تبریز ماموں کا ارادہ تھا کہ کچھ عرصے بعد جنید کو بھی اپنے پاس بلالیں گے۔ اس کے لیے وہ مسلسل کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

جنید پڑھنے میں بہت اچھا اور لائق تھا۔ اس نے ایف ایس سی اعزازی نمبروں سے پاس کی اور اسکالر شپ پہ پڑھنے کے لیے آسٹریلیا چلا گیا۔ جنید کی عمر کم تھی مگر اس کے بہتر اور محفوظ مستقبل کے لیے ام کلثوم کو دل پہ پتھر رکھنا پڑا اور اپنے دونوں بیٹوں کو خود سے دور بھیجنا پڑا۔

لاہور میں ام کلثوم کا چھوٹا سہی مگر اپنا ذاتی گھر تھا۔ جو لاہور کے اچھے علاقے میں تھا۔ دونوں بیٹوں کے جانے کے بعد 'گھر میں کوئی مرد نہیں رہا تھا۔ مگر یہ بھی شکر تھا کہ آس پاس رہنے والے لوگ 'بہت اچھے اور شریف تھے۔ اور کافی وقت سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اس لیے دونوں ماں بیٹی کا وقت سہولت سے کٹنے لگا۔ کچھ ام کلثوم بہت سمجھ دار اور سلیف میڈ خاتون تھیں اور انہی خطوط پہ انہوں نے اپنے بچوں کی بھی تربیت کی تھی۔

ماہ رخ کو ڈرنے ' خوفزدہ ہونے یا کسی پہ انحصار کرنے کے بجائے 'بہادری اور سمجھ داری سے حالات کا مقابلہ کرنا اور دنیا میں جینا سکھایا تھا۔ ام کلثوم خود گاڑی ڈرائیو کرتی تھیں اور آہستہ آہستہ انہوں نے ماہ رخ کو بھی ڈرائیونگ سکھادی تھی۔

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ احسن بھائی نے تعلیم مکمل کر کے تبریز ماموں کے ساتھ 'ان کے بزنس میں ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ اس کا ارادہ بھی اپنا ذاتی بزنس شروع کرنے کا تھا مگر فی الحال وہ ماموں کی زیر سر پرستی کاروبار کے داؤ پیچ سیکھ رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنا ذاتی کاروبار شروع کر سکتا تھا۔ اور پھر ماموں سے شراکت کر کے اس نے اپنے کاروبار کی بنیاد رکھی۔ اور دن بہ دن ترقی کا زینہ چڑھنے لگا۔

دوسری طرف جنید 'اپنی تعلیم مکمل کر کے آسٹریلیا میں ہی ایک کمپنی میں جاب کرنے لگا۔ اس کی جاب بہت اچھی اور ترقی کے کافی چانسز تھے۔

ماہ رخ ان دنوں ایم اے انگلش لٹریچر میں کر رہی

تھی جب احسن بھائی کی شادی تبریز ماموں کی بڑی بیٹی زارا سے ہوئی۔

زارا اور فرحین دو ہی بہنیں تھیں۔ شادی روایتی دھوم دھام سے پاکستان میں ہی ہوئی۔ یہ ان کے گھر کی پہلی خوشی تھی۔ جسے بھرپور طریقے سے منایا گیا۔ سارا خاندان کافی عرصے بعد اکٹھے ہوا تھا۔ جنید بھی پاکستان آیا ہوا تھا۔ احسن کی شادی میں ام کلثوم نے اپنی قریبی اور دل عزیز سہیلی رقیہ عرف بے جی کو بھی بلایا تھا۔ دونوں دوستیں کافی عرصے بعد ملی تھیں۔

بے جی ایبٹ آباد میں مقیم تھیں۔ جبکہ ام کلثوم لاہور میں کافی سال پہلے رقیہ (بے جی) کے والدین کچھ عرصہ لاہور مقیم رہے تھے۔ جہاں ان کے پڑوس میں ام کلثوم اپنے والدین اور اکلوتے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں اور یہاں سے ہی دونوں میں نہ مٹنے والی محبت اور دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ جو ساری زندگی قائم رہا۔ حتی کہ شادی اور بچوں کے بعد بھی۔ ہاں گھریلو مصروفیات کی وجہ سے ملنا ملانا بہت کم ہوتا تھا۔

احسن کی شادی پہ جہاں رقیہ (بے جی) ماہ رخ کی خوب صورتی اور سادگی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں۔ پر اعتماد، پڑھی لکھی، سلیقے سے اٹھنے بیٹھنے والی، نرم لہجے میں بات کرتی ماہ رخ انہیں اپنے اکلوتے اور وجیہہ بیٹے کے لیے پسند آگئی تھیں اور انہوں نے فوراً" ہی اس کا ذکر، ام کلثوم سے بھی کر دیا تھا۔ جو ایک لمحے کے لیے حیران اور پھر خاموش ہو گئی تھیں۔

جہانگیر بلاشبہ دیکھنے میں ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ مگر اس کے مزاج اور عادتوں کے بارے میں وہ ٹھیک سے نہیں جانتی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا۔

احسن کی شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو کچھ دن بے جی اپنی دونوں بیٹیوں اور مٹھائی کے ٹوکرے لیے، ماہ رخ کا ہاتھ باقاعدہ مانگنے چلی آئیں۔ ماہ رخ، سب کو ہی بہت پسند آئی تھی۔ اور بالآخر سب سے صلح مشورے اور جہانگیر سے ملنے کے بعد اس رشتے کے لیے ہاں کر دی گئی۔ اور یوں کچھ عرصے بعد ماہ رخ رخصت ہو کر جہانگیر کی بڑی سے حویلی میں چلی گئی۔

پیچھے ام کلثوم اکیلی رہ گئی تھیں۔ مگر یہ بھی شکر تھا کہ جنید ماں کا اکیلا پن دیکھ کر، واپس پاکستان آگیا تھا۔ اور ایک اچھی کمپنی میں جاب کرنے لگا تھا۔ اور وہاں ہی اس کی ملاقات مریم سے ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور گھر والوں نے رضامندی کی مہر لگا دی تو شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

☆ ☆ ☆

"کہاں ہو اتنے دن ہو گئے ہیں تمہاری جلی کٹی باتیں سنے ہوئے! تمہاری یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں؟؟"

کافی دنوں بعد آن لائن ہوئی تھی آج وہ بھی میلز چیک کرنے کے لیے۔ جب ایک کے بعد ایک میسجز آنے لگے۔ پہلے تو وہ نظرانداز کرتی رہی مگر اگلا بندہ بھی مستقل مزاج تھا۔ تنگ آکر اس نے میسجز کا جواب دیا اور سینڈ کر دیا۔

"آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟ کیوں تنگ کر رہے ہو کوئی کام نہیں ہے تمہیں!"

"ہائے! شکر ہے جواب آیا تو، چاہے تمہاری طرح کا خوب صورت نہ سہی! مگر چلے گا!" سامنے والے نے ڈھٹائی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔

"اچھا سنو۔۔۔!" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر میسجز آیا۔

"تمہاری آواز سنے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ مہربانی کر کے اپنی خوب صورت اور مترنم آواز کا رس میری سماعتوں کو بخش کر انہیں زندہ ہونے کا یقین دلا دو۔"

کلام کر کے میرے لفظ کو سہولت ہو
تیرا سکوت میری گفتگو محال کرے!

کچھ دیر وہ خاموش نظروں کے ساتھ اسکرین کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم سے سائن آؤٹ ہو گئی۔ آنکھوں میں پھیلتی نمی نے ہر منظر کو دھندلا دیا تھا۔

دوسری طرف وہ بھی اسی خاموشی اور چپ کے ساتھ ساکت نظروں سے اس کے نام کو دیکھے جا رہا

تھا۔ اس کے نام سے ہی تسکین کا ایک جہاں آباد ہو جاتا تھا۔ بعض لوگ زندگی میں ایسے بھی ہوتے ہیں ناں جو اپنے ہونے کے احساس سے ہی زندگی میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ اسے خوشنما بنا دیتے ہیں اور اگر زندگی جیسے یہ لوگ ہی زندگی میں شامل ہو جائیں تو!

لمحہ لمحہ سے خوشیاں کشید کرنا اور ہر لمحے میں صدیاں جی لینا اسی کو کہتے ہیں! اور اسے بھی اپنی زندگی ہی چاہیے تھی۔ محبت کے لمس سے بنی جاوداں زندگی!

☆ ☆ ☆

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ۔۔۔!" علشبہ نے کین کے بنے جھولے پہ آگے پیچھے جھولتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے ہمدان کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے پاس ہی چیئر پہ بیٹھی انوشے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ آج اتوار کا دن تھا۔ ہمدان صبح سویرے ہی آ دھمکا تھا۔ اس کے آتے ہی گھر میں عجیب طرح کا شور پیدا ہو گیا تھا۔ رحیمہ بی بی کو مختلف ہدایات دیتے اور ساتھ ہی ساتھ انوشے سے لمبے چوڑے ناشتے کی فرمائش کر کے مسلسل علشبہ کی کلاس لے رہا تھا۔ کیونکہ علشبہ جلدی بے دار ہونے کی وجہ سے مسلسل جمائیاں لے رہی تھی۔

انوشے نے رحیمہ بی بی کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کیا۔ جس سے بھرپور انصاف کیا گیا۔ اب نرم گرم دھوپ کا مزا لینے کے لیے تینوں ٹیرس پہ موجود تھے۔ مالٹوں سے بھری ٹوکری پہلے ہی اوپر پہنچ چکی تھی۔ علشبہ کی گود میں بھی مالٹے تھے۔ جبکہ انوشے کا دھیان کھانے سے زیادہ مالٹے چھیلنے میں تھا۔ کیونکہ ہمدان شہزادہ بن کر صرف حکم چلا رہا تھا۔ انوشے نے مالٹے چھیل کر نفاست سے پلیٹ میں رکھ کر ہمدان کو پیش کیے۔ جسے مزے سے کھاتے ہوئے وہ مسلسل انوشے پہ اعتراض بھی کر رہا تھا۔

"یہ مالٹے چھیلے ہیں تم نے؟ بندہ تھوڑی نفاست سے چھیلتا ہے۔ مگر چلو خیر ہے کزن ہو ایسے ہی کھا لیتا ہوں۔ دل کیا توڑنا۔"

ہمدان نے شان بے نیازی سے کہا تو انوشے گھور کر رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ انوشے اس کے ہاتھ سے پلیٹ جھپٹتی۔ علشبہ نے ایک دم سے ہی اپنی بات شروع کر دی۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ۔۔۔" علشبہ نے مالٹا چھیلتے ہوئے کہا۔

"تم کبھی کبھی سوچنے کا کام بھی کیوں کرتی ہو؟ جب اوپر والے کے کرم سے اتنے سالوں سے بغیر دماغ کے تمہارا کام چل ہی رہا ہے نا!"

ہمدان نے مزے سے کہا۔ مگر علشبہ ان سنی کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں سوچتی ہوں کہ آخر "لوگوں" کو اتنی اچھی جاب ملی ہے۔ سیلری پیکج بھی زبردست ہے مگر لوگوں نے آج تک ہمیں ٹریٹ نہیں دی ہے۔ کیوں انوشے! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا!" علشبہ نے ہمدان کو فوکس کرتے ہوئے کہا۔ تو ہمدان برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔

"جب بھی سوچنا کسی کا برا ہی سوچنا اس سے تو بہتر تھا کہ تم سوچتی ہی ناں۔ میں غریب بندہ مشکل سے یہ جاب ملی ہے اور تم نے پہلے ہی نظر میں رکھنا شروع کر دیا ہے۔"

ہمدان نے بے چارگی کا تاثر دیتے ہوئے علشبہ کو ٹالا تھا۔

"نظر میں تو کب سے رکھا ہوا ہے لوگوں کو ہی خبر نہیں ہے!" علشبہ نے سر جھکاتے ہوئے زیر لب کہا تو پاس بیٹھی انوشے نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنا چاہا۔ مگر جھکے سر کی وجہ سے اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکی۔ جبکہ ہمدان نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔

"ہمدان علشبہ ٹھیک کہہ رہی ہے تمہیں اتنی اچھی جاب ملی ہے۔ ہمیں ٹریٹ دو اور اگر تم نہیں مانے تو ۔۔۔!" انوشے نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اندر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"اگر نہیں مانا تو...." ہمدان نے انوشے کی پشت پہ بکھرے خوب صورت لچھے دار، کمر تک آتے بالوں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تو میں بابا جان سے شکایت لگا دوں گی۔ کیونکہ علشبہ ٹھیک ہے ناں!" انوشے نے پیچھے مڑ کر شرارت سے علشبہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ تو علشبہ خوشی سے کھل اٹھی۔

"یہ ہوئی ناں بات! یہ آئیڈیا مجھے کیوں نہیں آیا۔" علشبہ نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ ایسے نادر آئیڈیاز صرف دماغ والوں کو ہی آسکتے ہیں۔ ویسے تمہیں بابا جان کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہارا کہہ دینا ہی بہت ہے۔"

ہمدان نے انوشے کی سبز آنکھوں میں اترے شرارت کے رنگوں کو دیکھتے گہری مسکراہٹ سے کہا تھا' تو انوشے کندھے اچکاتی سیڑھیاں اتر گئی۔ دوپہر کے کھانے کا مینیو سوچتے ہوئے وہ کچن میں آگئی۔ جبکہ انوشے کے جاتے ہی ہمدان بھی ہلکی سی گنگناہٹ لیے بابا جان کی اسٹڈی میں چلا گیا۔ جبکہ پیچھے گم صم سی بیٹھی علشبہ ساکت نظروں سے اس کے چھوڑے نقش پا دیکھ رہی تھی۔

"انوشے کا کہنا ہی بہت ہے اور میری منت کرنا بھی...." علشبہ نے عجیب سی یاسیت میں گھرتے ہوئے سوچا تھا۔ موسم سرما کی نرم سی دھوپ' یک دم ہی جسم کو چبھنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ماہ رخ! اللہ نے ہمیں بہت بڑی خوشی سے نوازا ہے۔ بس بچے تم نے اپنا بہت خیال رکھنا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم بہت کمزور ہو۔ زیادہ چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔ ایک خادمہ مستقل تمہارے لیے رکھ دی ہے۔ جو بس تمہاری دیکھ بھال کیا کرے گی۔ خبردار سیڑھیاں زیادہ نہیں اترنی چڑھنی ہے۔ بلکہ ایسا کرو تم نیچے والے پورشن میں شفٹ ہو جاؤ۔ مجھے بھی آسانی رہے گی۔ جہانگیر تو ویسے ہی اکثر گھر پہ نہیں ہوتا ہے۔" بے جی نے خوشی سے مسلسل بولتے ہوئے کہا۔

شادی کے چھ مہینے بعد ماہ رخ کو ماں بننے کی نوید ملی تھی۔ خوشی اور بے یقینی سے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ جہانگیر بھی خوش تھا مگر بے جی کی مختلف ہدایتوں پہ چڑ کر رہ گیا۔ عادت نہیں تھی۔ نا کسی کو خود سے اہم اور آگے دیکھنے کی۔

"بے جی! آپ بلاوجہ ہی اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر نے اتنا بھی نہیں ڈرایا ہے۔ چلنا پھرنا تو اچھا ہوتا ہے صحت کے لیے۔ فضول کے نخرے اٹھا کر اس کا دماغ مت خراب کر دیجئے گا۔ پہلے ہی محترمہ کے شکوے ختم نہیں ہوتے ہیں مجھ سے۔"

جہانگیر نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے تیز نظروں سے ماہ رخ کو گھورتے ہوئے کہا۔ جس کا ہنستا مسکراتا چہرہ ایک دم سے ہی بجھ کر رہ گیا تھا۔

"خیر یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ میں جانوں یا میری بہو! میں کل ہی ماہ رخ کا سامان اپنے ساتھ والے کمرے میں رکھواتی ہوں۔ کم از کم میری نظروں کے سامنے تو رہے گی نا۔ تم تو ہفتہ ہفتہ بھر گھر نہیں ہوتے ہو۔ کام کی وجہ سے۔ یہ بے چاری اکیلی گھبرا جائے گی اس حالت میں۔" بے جی نے جہانگیر کی بات کے اثر کو زائل کرتے ہوئے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا۔

"کوئی نہیں گھبراتی یہ بے چاری! گھر میں اتنے نوکر ہیں' دیکھ لیں گے ان محترمہ کو بھی.... یہ بس اسی کمرے میں ہی رہے گی۔ بس میں نے کہہ دیا۔" جہانگیر نے بات ختم کرتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔ تو ماہ رخ لب کاٹتے ہوئے سر جھکا گئی۔ جبکہ ماہ رخ کے پاس بیڈ پہ بیٹھی بے جی نے پرسوچ نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ پہ اپنا مہربان لمس رکھتی' تسلی دیتی' اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

"بس رضیہ.... (خادمہ) کے ہاتھ دودھ کا گلاس

بھجواتی ہوں۔ ویسے بغیر مت سونا۔" بے جی نے جاتے جاتے ہدایت کی تو ماہ رخ اثبات میں سرہلا کر رہ گئی۔

"تم کیا چہرے پہ ہر وقت نحوست طاری کیے رہتی ہو کیا دکھانا چاہتی ہو دنیا کو؟ بہت ظلم ہوتے ہیں تم پہ، کس چیز کی کمی ہے تمہیں یہاں... مگر تم..." بے جی کے کمرے سے باہر نکلتے ہی جہانگیر نے غصے سے کہا۔ تو ماہ رخ ضبط کرنے کی کوشش میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"کیا مصیبت ہے۔ خوشی کے موقع پہ بھی رونا۔" جہانگیر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سگریٹ اور لائٹر اٹھا کر کمرے کے ساتھ بنے ٹیرس پہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ماہ رخ نے چہرے پہ بہتے آنسوؤں کو صاف کیا۔ اسی وقت رضیہ دروازہ ہلکا سا بجا کر دودھ کا گلاس لیے آگئی۔ "سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دو۔ کچھ دیر بعد پی لوں گی۔" ماہ رخ نے سستی سے کہا۔

"بے جی نے کہا ہے کہ آپ دودھ کا گلاس جب خالی کرلیں۔ تب ہی نیچے آؤں۔" رضیہ نے ٹرے پکڑے سعادت مندی سے کہا۔ تو ماہ رخ گہرا سانس لے کر رہ گئی اور اٹھ کر بیٹھ کر گلاس لبوں کو لگالیا۔ اسی وقت جہانگیر واپس کمرے میں آیا اور رضیہ کو دیکھ کر بولا۔

"میں اسٹڈی میں ہوں۔ ایک کپ چائے بجھوادو۔" جہانگیر نے میز پر سے اپنی فائل اٹھائی اور سائیڈ کا دروازہ کھول کر اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ جو کمرے کے ساتھ ہی منسلک تھا۔

"کچھ اور چاہیے ماہ رخ بی بی!" رضیہ نے مئودب لہجے میں پوچھا تو ماہ رخ نے واپس لیٹتے ہوئے نفی میں سرہلا دیا تھا۔ رضیہ سرہلاتی واپس چلی گئی۔ ماہ رخ کی آنکھوں سے آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے تھے۔

"بیٹا اپنے رویے اور لفظوں کی سختی سے زخمی کردیتا ہے اور بے جی اپنی نرمی اور محبت سے اس پہ اپنے مہربان لمس کا مرہم رکھ دیتی ہیں۔ دونوں ماں بیٹا ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔ الگ الگ انتہاؤں پہ کھڑے ہوئے اور میں... میں خود کہاں ہوں؟ ان چھ مہینوں میں میرا اصل وجود تو کہیں کھو کر ہی رہ گیا ہے۔ میری پسند، نہ پسند، خوشی، غم، ہنسی، رونا، اگر کچھ ہے تو بس جہانگیر کی "میں" اور ان کی ضد! وہ پتھردل، احساس، نرمی، چاہت کے ہر رنگ سے نہ آشنا ہے۔ بس تراشا ہوا سنگ مرمر کا حسین بت ہے۔"

ماہ رخ نے تھک کر آنکھیں موند لی تھیں۔

☆ ☆ ☆

پورے یورپ میں سردی کی شدید لہر نے نظام زندگی کو مفلوج کرکے رکھ دیا تھا۔ عمر ابھی ابھی گھر کے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے لانگ کوٹ پہ ننھے ننھے برف کے ذرات چپکے ہوئے تھے۔ باہر شدید برف باری ہورہی تھی۔

"ہیلو بگ برو۔" شہرام نے موبائل پہ گیمز کھیلتے ہوئے ایک نظر اسٹینڈ پہ کوٹ لٹکاتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شہرام، عمر سے سات سال چھوٹا تھا اور کالج میں زیر تعلیم تھا۔ آنکھوں پہ لگی عینک کے پیچھے سے جھانکتی ذہانت سے چمکتی آنکھیں، مقابل کو فوراً متوجہ کرلیتی تھیں۔ شہرام کے دو ہی شوق تھے۔ پڑھنا اور ویڈیو گیمز کھیلنا۔ جس پہ عمر اکثر اس کی کلاس لے لیتا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے جینیس..." عمر نے دستانے اتارتے ہوئے اس کے پاس صوفے پہ بیٹھتے ہوئے کہا، مگر حسب عادت شہرام کے گھنے اور ریشمی بال خراب کرنا نہیں بھولا تھا۔ جس پہ شہرام بہت چڑتا تھا۔

"بگ برو (بڑے بھائی) کتنی بار کہا ہے کہ میرا ہیئر اسٹائل خراب مت کیا کریں۔" شہرام نے منہ بناتے ہوئے ایک ہاتھ سے بال سیٹ کیے تو عمر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"یار اتنی فکر تو لڑکیوں کو بھی اپنے ہیئر اسٹائل کی نہیں ہوتی ہوگی۔ جتنی تمہیں ہے۔" عمر نے شرارت سے کہا۔

"بائی داوے! آپ کو بہت خبر ہے لڑکیوں کی 'پسند'

”نہ پسند کی؟ خیر تو ہے، کتنی لڑکیوں کو جانتے ہیں آپ۔“ شہرام نے موبائل پر سے نظریں اٹھا، اپنے دراز قد اور وجیہہ بھائی کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کی ذہین آنکھوں میں شرارت کی چمک واضح تھی۔

”جانتا تو صرف ایک کو ہی ہوں، بس وہ یہ بات مانتی ہی نہیں ہے۔“ عمر نے بھی اسی شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

”اچھا! میں بتاؤں گا پری آپی کو! وہ خود ہی ٹھیک کرلیں گی آپ کو۔“ شہرام نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”چلو تمہاری ہی سہی وہ کسی کی سنے گی تو نا۔“ عمر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اسی وقت کافی کے مگ لیے دونوں کی نوک جھوک پہ مسکراتی مما جان چلی آئیں۔

”تھینک مما جان! سچ میں کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی۔“ عمر نے مگ پکڑتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔ تو مما جان اپنا مگ پکڑ کر مسکراتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”دیگ برو اب آپ اپنی دلہن لے ہی آئیں۔ جو آپ کے نخرے برداشت کرسکے۔ مما جان کو میرے لیے ہی رہنے دیں۔“ شہرام نے منہ بناتے ہوئے کہا، تو مما جان بے ساختہ ہنس پڑیں۔

”چلو پھر ٹھیک ہے۔ عمر کی شادی کر ہی دیتے ہیں۔ پھر یہ جانے اور اس کی بیوی، ہم دونوں ماں، بیٹا عیش کریں گے۔“ مما جان نے شرارت سے عمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مما جان! دس از ناٹ فیئر.... آپ اگر شہرام کے ساتھ مل کر پارٹی بنائے گی تو مجھے مجبوراً“ ڈیڈ کی مدد لینی پڑے گی۔ آخر کو آخری فیصلہ ان کا ہی ہوتا ہے نا۔“ عمر نے اطمینان سے کہا۔ تو مما جان اسے گھور کر رہ گئیں۔

”تم سچ میں بہت تیز ہوگئے ہو۔ اب تمہاری دلہن لانی ہی پڑے گی۔ میں بات کرتی ہوں آج ہی تمہارے ڈیڈ سے۔ پری کو رخصت کروا کے لے ہی آتے ہیں اب۔ ویسے بھی ایک سال سے زیادہ ہوچکا ہے، تم لوگوں کے نکاح کو۔“

مما جان نے خاموش بیٹھے عمر کو دیکھتے ہوئے کہا اور خالی مگ اٹھا کر کچن میں چلی گئیں، جبکہ شہرام اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ عمر نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرکے، تصور کی آنکھ سے اس حسین پری کو اپنے آنگن میں چلتا پھرتا دیکھنے لگا۔ مگر تصور کی آنکھ سے دیکھے جانے والے خواب، حقیقت میں کب اتنی آسانی سے ڈھلتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

”تم کب ایبٹ آباد کا چکر لگا رہی ہو۔ کچھ بہت ضروری باتیں کرنی تھیں تم سے۔ مگر تمہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔“ کنیز پھوپھو نے فون پہ آمنہ کو لتاڑتے ہوئے کہا۔ جو ماں کی محبت بھری ڈانٹ پہ کھلکھلا کے ہنس پڑی تھیں۔

”امی جان آپ کے دونوں نٹ کھٹ سے نواسہ، نواسی ہی ہر وقت نچائے رکھتے ہیں۔“ آمنہ نے کہا۔

”یہ تو تم آج کل کی لڑکیوں نے بہانہ بنایا ہوا ہے۔ ہم بھی تھے ہمارے بھی بچے تھے۔ بھرا پڑا سسرال تھا۔ سب ہی دیکھتے اور سنبھالتے تھے۔“ کنیز پھوپھو نے ناک پر سے مکھی کی طرح اس کی بات کو جھٹلاتے ہوئے کہا تھا۔

”خیر میرا فون کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اور عائشہ اکٹھے ہو تو ہمدان کی شادی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ سیٹ ہوگیا ہے۔ مزید تاخیر کیا کرنی۔ عمران کی شادی تو میں نے بی اے کے دوران ہی کردی تھی۔ ماشاء اللہ سے جوان ہوتے بچوں کا باپ ہے۔ بس اب مجھے اس معاملے میں مزید دیر نہیں کرنی ہے۔“

کنیز پھوپھو! جن کے چار بچے تھے۔ عمران بڑا، اس سے چھوٹی آمنہ، پھر عائشہ، جو شادی شدہ اور اپنے اپنے گھروں میں خوش باش تھیں۔ ہمدان کی آمنہ سے بہت دوستی تھی۔ اسی لیے پھوپھو چاہتی تھیں کہ ہمدان

سے بات کرکے اس کی پسند معلوم کرے۔ عائشہ کی شادی' نید کے بیٹے سے ہوئی تھی اور وہ ایبٹ آباد میں ہی مقیم تھی۔

اچھا امی! میں پہلے ہمدان سے تو بات کرکے دیکھوں۔ اس کی مرضی کیا ہے۔ ددھیال میں تو کوئی اس کے جوڑ کی نہیں ہے۔ جو تھیں' وہ منگنی شدہ یا شادی شدہ ہوچکی ہیں۔ ہاں مگر ننھیال میں علشبہ بھی ہے۔ انوشے بھی ہے۔ دونوں ہی ہمیں بہت پیاری اور عزیز ہیں۔ مگر پسند ہمدان کی ہی چلے گی۔" آمنہ نے تفصیل سے کہا تو کنیز پھوپھو سوچ میں گم ہولیں۔

"ہوں! علشبہ بھی بہت پیاری بچی ہے۔ مگر نا سمجھ اور امیچور سی ہے۔ میرے ہمدان کے لیے' مجھے ہمیشہ سے انوشے ہی اچھی لگی۔ جس طرح بھابھی کے بعد اس نے بھائی صاحب کو سنبھالا اور سمجھداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ آج کل کی بچیوں میں کہاں ہوتی ہے اتنی سمجھ داری اور کیئر۔" کنیز پھوپھو نے اپنے دل کی بات کہتے ہوئے کہا۔ تو آمنہ نے بھی تائید کی۔ آمنہ بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے شروع سے ہی ماں کے زیادہ قریب تھی۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد آمنہ نے فون رکھ دیا۔ مگر اس کا ذہن مسلسل ہمدان میں الجھا ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد بھائی سے بات کرکے اس کی مرضی معلوم کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

نو مہینے کے صبر آزما انتظار اور تکلیفوں کو اٹھا کر' جب ملاہ رخ کی گود میں گلابی کمبل میں لپٹی سرخ و سفید' تیکھے نین نقش والی ننھی پری آئی تو اس کا دل اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگا۔ جس نے اسے ماں جیسے عظیم رتبے پہ فائز کیا تھا۔

"امی دیکھیں یہ کتنی خوب صورت ہے نا۔" جنید نے بے بی کاٹ میں لیٹی بچی کے گال کو ہلکے سے چھو کر کہا۔ جنید اور ام کلثوم' ملاہ رخ کے اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کا سن کر پہلی دستیاب فلائٹ سے ایبٹ آباد

پہنچ گئے تھے۔ ان کے اسپتال پہنچتے ہی بیٹی کی خوش خبری ملی تھی۔ ام کلثوم نے کئی دن پہلے سے ہی سب تیاریاں کر رکھی تھیں۔ ام کلثوم کی تو بہت خواہش تھی کہ ماہ رخ یہ عرصہ ان کے ساتھ گزارتی۔ کیونکہ پہلی دفعہ ماں بننے کا تجربہ بہت مختلف اور الگ ہوتا ہے۔

ماہ رخ بہت کمزور اور نڈھال ہوچکی تھی۔ سارا دن اکیلے اپنے کمرے میں خادمہ کے سہارے پڑی رہتی تھی۔ بے جی بار بار سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی تھیں۔ جوڑوں کے درد کی وجہ سے۔ جہانگیر ان دنوں اپنے کاروبار کو مزید وسعت دینے کے چکروں میں دن رات مصروف تھا۔ ایسے وقت میں' جب ماہ رخ کو اس کے ساتھ اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے ہی حالوں میں مست رہتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ہی کافی تھا کہ ایک عالی شان حویلی میں' پرتعیش کمرے میں' اس کی بیوی کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ بہترسے بہتر خوراک' خدمت اور دیکھ بھال کے لیے ملازموں کی فوج موجود تھی۔ ماہ رخ کو اور کیا چاہیے تھا؟

مگر ماہ رخ کبھی اپنے مجازی خدا کو یہ نہیں سمجھا سکی تھی کہ شوہر کے ساتھ "کانعم البدل' دنیا کی کسی چیز میں نہیں تھا۔ ماہ رخ کا نازک دل' اپنے شوہر کے التفات' اس کی محبت' اس کے نرم لفظوں کو ترستا تھا اور اس کی یہ خواہش ناجائز بھی نہیں تھی۔ ایک لڑکی جس نے ساری زندگی خود کو' اپنے جیون ساتھی کے لیے سنبھال کر رکھا ہوتا ہے۔ کیا شادی کے بعد اپنے جائز اور محرم رشتوں سے اس بات کی توقع رکھنا بھی غلط ہوتا ہے۔ جیون ساتھی' جس کے ساتھ کے لیے' وہ اپنے گھر' اپنے پیارے والدین' بہن' بھائیوں کو چھوڑ کر بالکل انجان جگہ پہ آئی ہے۔ کیا بدلے میں تھوڑی سی توجہ' محبت' عزت اس کا حق نہیں بنتی ہے۔

مگر یہ بات عموماً جہانگیر جیسی سوچ رکھنے والے مرد نہیں سوچتے ہیں۔ جو صرف اپنی ذات کے گرد ہی گھومتے اور سوچتے ہیں۔ ام کلثوم نے جب ماہ رخ کو اپنے پاس آنے کا کہا تو ماہ رخ نے شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی نرمی سے منع کردیا تھا۔ ام کلثوم جہاندیدہ

عورت تھیں۔ وہ جہانگیر کے مزاج اور اس کے روکھے پن کو سمجھ چکی تھیں' اسی لیے خاموش ہو گئی تھیں۔ جنید کی شادی' ماہ رخ کے فارغ ہونے کے انتظار کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد ہونا قرار پائی تھی۔

بے جی نے سارے اسپتال میں مٹھائی بانٹی تھی۔ ان کی خوشی دیدنی تھی۔ ام کلثوم نے اس پہ بھی شکر ادا کیا کہ کہیں پوتے کی تمنا میں' وہ پوتی کو نہ قبول کرتیں۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ "جہانگیر کہاں ہے؟" ام کلثوم نے بے جی سے پوچھا جو پوتی کو بہت پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ چونک گئیں۔

"جہانگیر ایک ہفتے سے کراچی گیا ہوا ہے۔ میں نے فون کر دیا تھا۔ پہلی دستیاب فلائٹ سے پہنچ جائے گا۔ بہت خوش تھا وہ بیٹی کی پیدائش کا سن کر۔" بے جی نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو ام کلثوم نے مسکرا کر اثبات میں سرہلا دیا۔ جبکہ ماہ رخ نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ کہیں اس کی آنکھوں میں پھیلتی نمی کوئی اور نہ دیکھ لے۔ مگر درد سے کراہتے دل کی سسکیاں' سارے وجود میں پھیل رہی تھیں۔ اتنے اہم اور نازک وقت پہ بھی وہ ماہ رخ کے ساتھ تو کیا پاس بھی نہیں تھا۔

عورت اتنا درد' اتنی تکلیف اٹھا کر اپنے بچے کو دنیا میں لاتی ہے اور اس کے بدلے مرد کی توجہ' اس کا مہربان لمس' ہمدردی کے چند بول' عورت کو مان' یقین اور تحفظ کے حصار میں لیے آسمان پہ بٹھا دیتے ہیں مگر جہانگیر سے ایسے کسی بھی عمل کی توقع رکھنا' خود کو دکھ دینے کے برابر تھا۔ مگر ماہ رخ ہر بار کسی نئی امید کا سرا تھامتی اور ٹوٹنے پہ دہری اذیت سے دوچار ہوتی تھی۔

رات تک جہانگیر بھی پہنچ گیا۔ بچی کو گود میں لے کر بے ساختہ اپنے لب اس کے ماتھے پہ رکھ دیے۔ بچی کی آنکھیں جہانگیر پہ تھیں اور نین نقش ماہ رخ جیسے۔ جہانگیر کو بچی سے والہانہ پیار کرتے دیکھ کر' ماہ رخ کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پہ مطمئن مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ جہانگیر نے بچی کا نام "انوشے" رکھا تھا۔ ماہ رخ کو بھی یہ نام بہت پسند آیا تھا۔ یوں انوشے کے آنے سے ان کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ وہ باب جس میں جدائی کی بہت لمبی لکیر کھینچی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

انوشے تین سال کی ہو چکی تھی' اس دوران بہت دھوم دھام سے جنید کی شادی مریم سے ہو چکی تھی۔ مریم کا تعلق کافی آزاد خیال فیملی سے تھا اور اسی وجہ سے جہانگیر کو مریم اور اس کی فیملی پسند نہیں آئی تھی اور حسب عادت اور روایت جنید کی شادی پہ بھی ماہ رخ کو دو دن پہلے جانے کی اجازت ملی تھی۔ ام کلثوم کی لاکھ یاد دہانی اور بار بار کے بلاوے پر بھی ماہ رخ بھائی کی شادی پہ اس طرح شرکت نہ کر سکی۔ جیسے اسے کرنا چاہیے تھا۔

شاپنگ تو خیر مریم نے سب اپنی پسند سے کی تھی۔ مگر پھر بھی قدم قدم پہ ام کلثوم کو بیٹی کی کمی محسوس ہوتی رہی تھی اور جنید کو بہن کے لاڈ اور ہنسی مذاق کی۔ یہ بھی شکر تھا کہ حسن بھائی' اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ شادی میں شرکت کرنے کے لیے دس دن پہلے ہی آگئے تھے۔ زارا نے بڑی بہو ہونے کے ساتھ ساتھ' بیٹی ہونے کا بھی حق ادا کیا تھا۔

وہ سب جہانگیر کی فطرت اور مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ اس لیے ماہ رخ کو شرمندہ کرنے' یا دکھ دینے کے بجائے' اس کا حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے۔ جنید کی شادی بخوبی سرانجام پائی۔ مگر یہاں بھی ماہ رخ کے لیے ایک بات مسئلہ بنی رہی۔ مریم کا بھائی' جو ماہ رخ سے بھی ایک سال چھوٹا تھا۔ بہت ہنس مکھ اور شرارتی طبیعت کا تھا۔ شادی میں اس نے خوب ہلا گلا کیا۔ سمیر نے سب کو مذاق کی پشت میں لیا اور اسی وجہ سے ماہ رخ سے بھی فری ہونے کی کوشش کی۔ جو جہانگیر کی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی اور جہانگیر کا مزاج مزید غضب ناک ہو گیا تھا ماہ رخ کے ساتھ۔ بظاہر بھائی کی شادی پہ ہنستی مسکراتی ماہ رخ' اندر سے ڈری سہمی سی رہتی تھی کہ کون سی بات یا چیز جہانگیر کو بری لگ جائے۔ جہانگیر اسے لے کر اپنے

ساتھ ہی آیا تھا ایک ہفتے کے لیے 'بے جی شادی والے دن پہنچی تھیں۔ جن کے آنے سے ماہ رخ کو کافی ڈھارس پہنچی تھی۔ جہانگیر جیسا پتھر صرف دو لوگوں کے سامنے موم ہوتا تھا' ایک تو تھیں بے جی اور دوسری انوشے۔

ماہ رخ جانتی تھی یا اس کا رب کہ وہ کس طرح قدم قدم پہ ایک ایسے مرد کے ساتھ نبھا کر رہی تھی جو ہر معاملے' ہر چیز میں 'ماہ رخ سے لاپروا ہونے کے ساتھ ساتھ 'اس کی تذلیل کرنا' سخت لفظوں کے تیروں سے زخمی کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ہاں جسمانی مار پیٹ سے کبھی کام نہیں لیا تھا اس نے 'مگر جسمانی مار پیٹ سے زیادہ 'تکلیف دہ' رویوں کی مار ہوتی ہے اور مزے کی بات ہے کہ اس کے نشان' آپ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتے۔

دنیا وہ دیکھتی ہے جو نظر آتا ہے۔ ماہ رخ کی زندگی کا بہترین رخ۔ خوب صورت' وجیہ شوہر روپے پیسے کی ریل پیل' نوکروں کی فوج' اچھے سے اچھا پہننا اوڑھنا' سونے کے زیورات سے سجی ایک خوب صورت مورت۔

مگر ماہ رخ کا دل جانتا تھا کہ وہ اندر سے کتنی ٹوٹی اور بکھری ہوئی ہے۔ جہانگیر کا اخلاق اور رویہ 'ماہ رخ کے گھر والوں کے ساتھ بہت روکھا اور تلخ تھا۔ وہ کبھی بھی ماہ رخ کے ساتھ اپنے سسرال آنا یا رہنا پسند نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی سے گھلنے ملنے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر کبھی آیا بھی تھا تو چند گھنٹوں میں ہی ماہ رخ' جہانگیر کے اعتراضات اور نکتہ چینی سے گھبرا جاتی تھی۔ اس لیے ماہ رخ میکے کا رخ بہت کم کم کرتی تھی۔

ایک بار بے جی نے ماہ رخ کو بتایا تھا کہ جہانگیر بچپن سے ہی بہت ضدی اور خود سر تھا۔ اس میں انتہا پسندی ہمیشہ سے رہی تھی۔ وہ بہت چھوٹی چھوٹی بات پر اپنے بہت اچھے اور گہرے دوستوں کو چھوڑ دیتا تھا۔ ان سے تعلق ختم کر دیتا تھا۔ معاف کرنے کا مادہ اس میں نہیں تھا۔ وہ جلد باز تھا۔ اکھڑ اور خود سر تھا۔ اپنی انا کا پرچم ہمیشہ بلند رکھتا تھا۔ جب تک باپ کا سایہ سر پہ رہا جہانگیر پھر بھی سن لیتا تھا۔ مگر جب خود مختاری اور مکمل آزادی مل گئی تو اس کے مزاج کی سختی اور غصیلا پن کھل کر سامنے آگیا تھا۔ دو بہنیں بڑی ہونے کے باوجود جہانگیر کے غصے سے خائف رہتی تھیں۔ مگر جہانگیر نے ہمیشہ اپنی بڑی بہنوں کا احترام کیا تھا۔

صرف بے جی ہی وہ واحد فرد تھیں جو جہانگیر کو لگام ڈال لیتی تھیں۔ اسی لیے ماہ رخ بہت کچھ خاموشی اور صبر سے برداشت کر لیتی تھی اور پھر انوشے کے آنے سے اس کا ذہن کافی حد تک بٹ گیا تھا۔ انوشے بہت شرارتی اور ذہین بچی تھی۔ ہر وقت ماں کو اپنے ساتھ مصروف رکھتی تھی۔ انوشے کے زیادہ تر کام ماہ رخ خود کرتی تھی۔ اس لیے اس کے دن اور رات جہانگیر کی بے اعتنائی پہ جلنے یا کڑھنے کے بجائے انوشے کی معصوم کھلکھلاہٹوں سے سجنے لگے تھے۔

زندگی کچھ سہل لگنے لگی تھی جب اس ہنستی مسکراتی زندگی میں موت کا سناٹا گونجنے لگا۔ بے جی بہت خاموشی سے اجل پہ لبیک کہتی عدم کو سدھار گئیں۔ بے جی کی اچانک موت نے جہانگیر کو بہت دھچکا پہنچایا تھا۔ جہانگیر کے ساتھ باقی سب کے لیے بھی یہ بہت بڑا صدمہ ثابت ہوا تھا۔ بے جی کا کمزور اور ناتواں وجود ایک مہربان سایہ دار درخت کی مانند تھا۔ ان کے گزر جانے کے بعد ماہ رخ نے جانا تھا کہ رویوں کی تپتی دھوپ میں زندگی کا سفر کتنا مشکل اور دشوار ثابت ہوتا ہے۔

جہانگیر کا مزاج آگ اگلتے سورج کی مانند ہو گیا تھا اور ماہ رخ موم کی بنی نازک سی لڑکی! ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

تم نے آگے کیا کرنے کا سوچا ہے۔ تمہیں ماسٹر کیے ہوئے ایک سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ ویسے تو تمہیں اب پیا گھر سدھار دینا چاہیے 'مگر جب تک ایسا کچھ نہیں ہوتا تم کوئی جاب ہی کرو۔ انگلش لٹریچر میں ماسٹر کرنے کا فائدہ۔"

دونوں اس وقت رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ کچن میں موجود میز پہ ڈھیر ساری سبزیاں پھیلائے، چائنیز بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ زیادہ کام تو انوشے ہی کر رہی تھی۔ علشبہ کی زبان زیادہ تیز چل رہی تھی' ہاتھوں کی نسبت۔

کٹنگ بورڈ پہ نفاست سے گاجر کو کاٹتی' انوشے نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "فی الحال میرا کسی چیز کا بھی موڈ نہیں ہے۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

علشبہ نے غور سے اپنے سامنے بیٹھی انوشے کو دیکھا تھا۔ بلیک رنگ کے کپڑوں میں قمیص کے دونوں بازوؤں' کہنی تک چڑھائے ہوئے تھے۔ جوڑے میں لپٹے بالوں کی لٹیں چہرے کے اطراف بکھری ہوئی تھیں۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ مگر اس کی سبز رنگ کی آنکھوں میں ہلکی سی لالی اور اداسی کی لہر بہت واضح محسوس ہوتی تھی۔ اس کے لہجے اور باتوں میں ایک واضح اکتاہٹ تھی۔ علشبہ کو آئے پندرہ دن ہوچکے تھے اور وہ مسلسل انوشے کو کسی سوچ میں گم دیکھتی تھی۔ اکثر رات کو دیر تک جاگنا' عجیب مضطرب سی رہتی تھی۔ "انوشے تم بہت بدل گئی ہو اور ایسا پچھلے تقریباً" ایک ڈیڑھ سال سے ہوا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ممانی جان کی موت کا صدمہ' تمہیں بالکل بدل گیا ہے۔ بہت خاموش اور الجھی الجھی سی رہنے لگی ہو تم۔"

علشبہ نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ جو یک دم ہی گم صم سی ہوگئی تھی۔ پھر علشبہ نے دیکھا' اس کی آنکھوں کے کٹورے لبالب بھر گئے تھے۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو علشبہ مما کی موت کو آج بھی قبول کرنا بہت مشکل لگتا ہے' ایسا لگتا ہے جیسے ان کے ساتھ ہی میری خوشی اور سکون چلا گیا ہے۔"

(میرے دل پہ بہت بوجھ ہے کسی راز کا۔ بس کیسے اور کس سے کہوں! اور یہ بوجھ ہے کہ میری سانسیں لینا محال ہوگیا ہے۔)

انوشے نے رندھے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے' باقی کے جملے دل میں سوچے تھے۔ علشبہ نے اٹھ کر انوشے کے گال پہ بہتے آنسو صاف کیے تھے اور اسے خود سے لگا کر تسلی دینے لگی تھی۔ انوشے اتنے دن بعد' کسی اپنے کو پاس پا کر اس کے ہاتھ پہ سر رکھ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ کتنے دنوں سے روکا ہوا تھا' آنسوؤں کے اس سیلاب کو' آج کسی بہانے ہی سہی انہیں نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔

کسی کام سے کچن کی طرف آتے بابا جان نے انوشے اور علشبہ کی باتیں سن لی تھیں۔ اپنی عزیز از جان اور لاڈلی بیٹی کو اس طرح روتے دیکھ کر ان کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ سختی سے ہونٹ بھینچے وہ واپسی کو مڑ گئے تھے۔ اب انہیں سمجھ آرہی تھی کہ انوشے میں آنے والے بدلاؤ کی اصل وجہ کیا تھی۔ نہ جانے وہ کیوں اس بات کو سمجھ نہیں سکے تھے۔ ماں کی موت نے اسے اکیلا کردیا تھا۔ اب انہیں انوشے کو واپس زندگی کی طرف لانا تھا اور اس کا حل انہوں نے سوچ لیا تھا' انوشے کی جلد از جلد شادی کردینا۔ وہ مضبوط قدم اٹھاتے' اپنے کمرے کی طرف چل پڑے تھے۔ بہت جلد ہی وہ انوشے کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔

مگر فیصلہ انسان نہیں اوپر والا کرتا ہے اور کیا خوب کرتا ہے کہ ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں اپنی عقل اور فہم کی بساط پہ مان کر کے چلنے والے' ہم دراصل کتنے نادان اور لاعلم ہوتے ہیں۔

✡ ✡ ✡

"آجاؤ عمر! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" عمر نے ہلکا سا دروازہ ناک کیا تو اندر سے ڈیڈ کی بارعب آواز آئی۔ عمر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ مما جان' جائے نماز بچھائے نماز پڑھنے میں مشغول تھیں' جبکہ ڈیڈ اپنے سامنے رکھی فائلوں میں سر کھپا رہے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے یہ ان کا معمول تھا۔ عمر چلتا ہوا ان کے ساتھ صوفے پہ ہی بیٹھ گیا۔ دونوں باپ' بیٹا میں دوستی بھی بہت تھی اور انڈر اسٹینڈنگ بھی۔

"جی ڈیڈ آپ نے بلایا تھا۔" عمر نے کچھ لمحوں کی

خاموشی کے بعد پوچھا۔

"ہوں! کل میری تمہاری ماما جان سے تفصیلی بات ہوئی تھی اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہاری شادی کردی جائے۔ نکاح کو ایک سال سے زیادہ ہوگیا ہے۔ میرے خیال سے رخصتی میں مزید دیر مناسب نہیں ہے' اب جبکہ تم بزنس کو بہت اچھی طرح سے سنبھال بھی رہے ہو۔"

ڈیڈ نے اپنا سنہری نظر کا فریم اتار کر سامنے میز پہ رکھا اور پیشانی کو مسلتے ہوئے آہستہ آواز میں کہنے لگے۔ وہ کسی الجھن کا شکار لگ رہے تھے۔ عمر جانتا تھا' مگر خاموش تھا فی الحال' وہ اگلی بات کا منتظر تھا۔

"مگر تم جانتے ہو کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے اور آنے والے وقت کے خدشات میرے دل کو گھیرے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پری کو کسی تکلیف یا پریشانی سے نہ گزرنا پڑے۔ بہت عزیز ہے مجھے وہ۔ میں اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ مگر۔۔۔"

ڈیڈ نے کہتے ہوئے بے ساختہ گہری سانس لی تھی۔ پری سے ان کی محبت اور اٹیچ منٹ کو سب ہی جانتے اور مانتے تھے۔

"ڈیڈ آپ ٹینشن مت لیں ڈاکٹر نے پہلے ہی آپ کو زیادہ اسٹریس لینے سے منع کیا ہوا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عمر نے باپ کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی تھی۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھے ان کے لیے زیادہ ذہنی دباؤ اچھا نہیں تھا۔ اس لیے سب احتیاط کرتے تھے کہ وہ زیادہ سوچیں نہیں۔ اسی وقت مما جان بھی نماز پڑھ کر فارغ ہو گئیں اور اٹھ کر ان کے پاس آگئیں۔

"میں نے اسی لیے' پہلے ہی کہا تھا کہ جلد بازی سے کام مت لیں۔ مگر اس وقت جو کیا وہ بھی مجبوری تھی۔ اب یہ سوچنا ہے کہ آگے کیا کیا جائے۔ اس بے یقینی کی کیفیت سے تو باہر نکلے ہم لوگ۔" مما جان نے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"عمر میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار کھل کر پری سے بات کرلو۔ تاکہ ہمیں آگے کا لائحہ عمل طے کرنے میں آسانی ہو۔ میں یا تمہاری مما جان اگر بات کریں گے تو وہ جھجک سکتی ہے تم سے اس کی بہت دوستی ہے۔ تمہاری بات وہ سمجھ بھی لے گی۔"

ڈیڈ کے کہنے پہ عمر نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور انہیں شب بخیر کہتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ اپنے بیڈ پہ لیٹتے ہوئے اس نے موبائل ہاتھ میں لیا اور اس کا نمبر ملایا۔ بیل جاتی رہی مگر اس نے نہ اٹھانے کی جیسے قسم اٹھا رکھی تھی۔ کچھ دیر عمر سوچتا رہا۔ پھر جلدی جلدی ٹائپ کرتا ہوا **مسیج** لکھا اور سینڈ کردیا۔

اے چشم درد آشنا

اک بوند برس

اک اشک چھلک

خاموش نظر

کوئی بات تو کر

دل دکھتا ہے!

تو میرے دل پہ ہاتھ تو رکھ

میں تیرے ہاتھ پہ دل رکھ دوں

دل درد بھرا۔۔۔۔!

جو اس کو چھوئے

یہ اس سے ملے

اک لفظ محبت بول ذرا

میں سارے لفظ تجھے دے دوں

دل درد سراب کو آب سے بھر

تو میرے خواب پہ آنکھ تو دھر

میں تیری آنکھ میں خواب بھر دوں

خاموش محبت

بات تو کر۔۔۔۔!

عمر نے موبائل کو سینے پہ رکھا اور چت لیٹ کر چھت کو گھورتا' جواب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اس کا انتظار' انتظار ہی رہا۔ یہ وقت کا کیسا ہیر پھیر تھا' اس کی بہترین دوست' ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرنے والے' جب نکاح جیسے مقدس اور مضبوط بندھن میں بندھے اور یکسر ایک دوسرے سے انجان ہو گئے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے صدیوں کے فاصلوں پہ

چلے گئے تھے۔ عمر کا دل یہ تو نہیں مانتا تھا کہ وہ محبت جیسے جذبے سے نا آشنا ہو گی۔ محبت میں ایک دل کا دوسرے دل سے کنکشن براہ راست ہوتا ہے۔ اسی لیے تو محبت میں الہام ہوتے ہیں کچھ ایسے ہی الہام اس کے دل کی سرزمین پہ اترتے تھے۔ جو اس کے ہونے کا یقین دلاتے تھے۔

ایک طرف وہ جواب آنے کے انتظار میں جلا تھا' دوسری طرف وہ موبائل کو دیکھتی بھیگی آنکھوں اور کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ لکھنے اور نہ لکھنے کی دوہری اذیت کا شکار تھی۔ محبت بھی ایک تھی' انتظار بھی ایک جیسا تھا اور اس کی اذیت بھی! پھر ایسی کون سی چیز تھی جو محبت کو بولنے نہیں دے رہی تھی؟ جو محبت سے بڑھ کر ثابت ہو رہی تھی۔

کیا محبت سے بڑھ کر بھی کچھ ہوتا ہے؟ ہاں کسی کا اپنے پہ مان' یقین اور بھروسہ! جس کے ٹوٹنے سے رشتے ہی نہیں' ہم بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور ایسی ہی مان بھروسے اور یقین کی دیواروں میں وہ قید اپنی محبت پہ نوحہ پڑھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ یہاں کیا کرنے آیا ہے؟" جہانگیر نے ڈرائنگ روم میں صوفے پہ براجمان سمیر کو دیکھتے ہوئے درشتی سے ماہ رخ سے پوچھا تھا۔ جو خادمہ کو کھانے کی ہدایت دینے کچن میں آئی تھی۔ انوشے سمیر کے پاس تھی۔ جہانگیر حویلی واپس آیا تو ڈرائنگ روم سے آتی سمیر اور انوشے کی آوازوں نے اسے متوجہ کر لیا تھا۔ اور سمیر کو دیکھتے اس کی تیوری چڑھ گئی تھی۔ وہ تنتناتا ہوا کچن میں آیا اور خادمہ کا لحاظ کیے بغیر ماہ رخ کا ہاتھ پکڑ کر سختی سے اس کا رخ اپنے طرف موڑا اور شعلہ بار آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے' درشتی سے پوچھنے لگا۔

"جہانگیر میرا ہاتھ چھوڑیں۔ سب دیکھ رہے ہیں۔" ماہ رخ نے تکلیف کی شدت سے لب کاٹتے ہوئے کہا تو جہانگیر غصے میں اس کا ہاتھ جھٹکتا' واپس مڑ گیا ماہ رخ نے نوکروں کے سامنے ہوئی تذلیل پہ لب کاٹتے' آنسوؤں کو پیتے' کچن سے باہر نکل آئی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ جہاں جہانگیر غصے میں ٹہل رہا تھا۔ ماہ رخ کو دیکھ کر وہ رک گیا اور دونوں ہاتھ سینے پہ باندھ کر' لب بھینچے' شعلہ بار نگاہوں سے گھورنے لگا۔ ماہ رخ انگلیاں موڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

جہانگیر کو ماہ رخ کا میکے جانا اور ان کا یہاں آنا ویسے ہی پسند نہیں تھا اور مریم اور اس کی فیملی کو تو وہ ویسے ہی سخت ناپسند کرتا تھا اور مریم کے بھائی سمیر کی حرکات و شوخیاں' وہ شادی پہ دیکھ چکا تھا۔ اور اسی وجہ سے ماہ رخ جنید کی شادی میں بھی جہانگیر کے غصے کے زیر عتاب رہی تھی اور اسی ناپسندیدہ شخص کو اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود دیکھنا' اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے تم جانتی ہو کہ مجھے سخت چڑ ہے ایسے لوگوں سے جنہیں اپنی حدود و قیود کی پاسداری کرنی نہ آتی ہو۔ جو اپنی تہذیب و روایات سے انجان ہوں۔"

جہانگیر نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"امی نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔ انوشے کے لیے وہ ہی دینے آیا ہے۔ وہ دراصل اپنے کسی ذاتی کام سے ایبٹ آباد ایک ہفتے کے لیے آرہا تھا تو امی نے۔"

ماہ رخ نے ہکلاتے ہوئے جلدی جلدی وضاحت دینے کی کوشش کی۔

"فوراً" سے پہلے اسے یہاں سے چلتا کرو اور خبردار میں دوبارہ اسے یہاں نہ دیکھوں۔"

جہانگیر نے غصے سے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی اور زور سے دروازہ بند کرتا اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ پیچھے کھڑی ماہ رخ کے رکے آنسو چہرے پہ بہنے لگے تھے۔ کہنے کو وہ اس شخص کی بیوی تھی' شریک حیات! مگر اپنے گھر میں وہ کسی مہمان کو اپنی مرضی سے خوش آمدید بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

لوگوں کی تہذیب اور روایات پہ انگلی اٹھانے والا'

خود اپنے گھر میں آئے مہمان کی عزت کرنا نہیں جانتا تھا۔ ماہ رخ نے دیکھا تھا کہ بے جی مہمانوں کو کتنی عزت و تکریم دیتی تھیں۔ ماہ رخ کی دونوں نندیں بھی ایسی ہی تھیں۔ بھلے کم کم ہی میکے آتی تھیں مگر ان کے طور و طریقے اور عادات اپنی ماں جیسی ہی تھیں۔ اس لیے ماہ رخ کی ان کے ساتھ بہت اچھی دوستی بھی تھی۔

ماہ رخ نے گالوں پہ پھیلے آنسوؤں کو صاف کیا اور خود کو سنبھالتی ڈرائنگ روم تک آئی تو سمیر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا تھا۔ وہ چلا گیا اور ماہ رخ خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔ وہ ایک بار بھی اسے دوپہر کے کھانے پہ رکنے کا نہیں کہہ سکی تھی۔ اس حویلی کی یہ روایات تو کبھی بھی نہیں رہی تھی کہ مہمان کھانے کے وقت بغیر کھائے چلا جائے۔ مگر روایات کو نبھانے والے لوگ منوں مٹی تلے سو چکے تھے۔ اب صرف اپنی انا اور تنگ نظری کا پرچم بلند کیے ایک بے حس شخص رہ گیا تھا۔ جو صرف حکم چلانا جانتا تھا۔ اپنی مرضی کرنا!

☼ ☼ ☼

بابا جان نے بڑی بہن ہونے کے ناطے اس سلسلے پہ کنیز پھوپھو سے بات کی۔ وہ چاہتے تھے کہ انوشے کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ بتائیں۔ اور کنیز پھوپھو تو پہلے ہی سب تیاری کرکے بیٹھی ہوئی تھیں آمنہ نے ان کے کہنے پر ہمدان سے بات کی تھی اور وہ بھی انوشے کو پسند کرتا تھا۔ کچھ دنوں تک کنیز پھوپھو ایبٹ آباد سے اسلام آباد آنے والی تھیں۔ باقاعدہ رشتے کی بات کرکے مگر اس سے پہلے ہی بھائی کے فون نے انہیں اپنی بات کہنے کا موقع دے دیا اور کنیز پھوپھو نے موقع ضائع کیے بغیر ہمدان کے لیے انوشے کا ہاتھ مانگ لیا۔

بابا جان ہمدان کے نام پہ چونک کر رہ گئے۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ہمدان ان کی آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا تھا۔ سب سے بڑی بات انہیں بہت پسند تھا۔ اور انوشے شادی کے بعد بھی ان کے پاس ہی رہتی۔ کیونکہ ہمدان کی جاب اسلام آباد میں تھی۔ بابا اسی وقت ہاں کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر کنیز پھوپھو کی اگلی بات نے انہیں خاموش کروا دیا۔

"میں چاہتی ہوں کہ یہ شادی بچوں کی پسند اور رضا مندی سے ہو۔ انوشے کی ماں آج زندہ ہوتی تو یہ مرحلہ بہت آسان ہو جاتا۔ مگر انوشے کی پسند ناپسند کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے ہیں۔ پہلے آپ انوشے کی مرضی معلوم کرلیں۔ پھر جس دن آپ کہیں گے ہم سر کے بل چل کر رشتہ لینے آجائیں گے۔ مجھے آپ کے فون کا بہت بے صبری سے انتظار رہے گا۔"

فون بند کرنے کے کتنی دیر بعد تک بھی بابا جان گم صم سے بیٹھے رہے۔ کوئی چیز تھی جو کانٹے کی طرح چبھی تھی۔ شاید بیٹی سے شدید محبت کرنے والا باپ اس کی زندگی کے اہم ترین مرحلے پہ اس کی رضا جاننے یا پوچھنے کے بجائے اپنی پسند کو ہی حرف آخر سمجھ رہا تھا۔

"مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ شادی کے لیے انوشے کی پسند ناپسند معلوم کرنی چاہیے! میں اتنا لاپروا کیسے ہو سکتا ہوں کہ اتنی اہم بات میری ذہن میں نہیں آئی۔" بابا جان نے پیشانی ملتے ہوئے صوفے سے اٹھے۔

"اور کہیں ایسی ہی مرضی اور لاپروائی میں اس کی زندگی کے ہر معاملے میں تو نہیں برتتا رہا؟"

اچانک بابا جان کے اندر سے آواز آئی تو وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ آج یہ کیسی عجیب سی سوچیں تنگ کرنے آ رہی تھیں! وہ دوبارہ صوفے پہ بیٹھ گئے تھے۔ کسی گہری سوچ میں گم صم سے!

☼ ☼ ☼

"آخر کیا چاہتی ہو تم؟ کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ ایسا تم! کیا تم نہیں جانتیں میرے لیے تم کیا ہو؟"

کتنے دنوں بعد اس سنگ دل کی آواز کانوں کے نہج پن پہ بارش کی بوندوں کی طرح پڑی تھی۔ عمر کو لگ رہا تھا کہ اس کے اندر زندگی پھر سے دوڑنے لگی ہے اور زندگی جیسے لوگوں کے لہجے اتنے ہی سرد تھے۔

"میں بتا چکی ہوں تمہیں اپنا آخری فیصلہ.... مجھے یہ رشتہ قائم نہیں رکھنا ہے۔" فون سے ابھرتی سرد آواز' کے لفظ نوکیلے پتھر جیسے تھے۔ اس کے ماتھے کی رگیں تن گئیں۔ فون پہ گرفت مضبوط ہو گئی۔

"وجہ جان سکتا ہوں میں!" عمر نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"بس مجھے تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزارنی ہے۔ میں اپنی پسند ناپسند میں آزاد ہوں۔"

دوسری طرف سے اسی مضبوطی کے ساتھ کہا گیا۔

"تم میرے بغیر بھی زندگی نہیں گزار سکتی ہو میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں پری! تم موم سے بنی' نازک احساسات و جذبات رکھنے والی کانچ کی نازک سی گڑیا ہو کیوں خود کو پتھر بنانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔

اس کوشش میں تم پتھر بنو یا نہ بنو مگر ٹوٹ ضرور جاؤ گی! اور ایسا کبھی ہوا تو یقین رکھنا تمہاری ذات کے بکھرے کانچ' میں اپنے جسم کی پور پور سے چنوں گا تاکہ تمہارے ٹوٹنے کے دکھ کو' اپنے زخمی وجود میں مدغم کر سکوں پھر تمہارا دکھ اور میرا درد برابر ہو جائیں گے۔ ایک جیسے ہو جائیں گے۔" عمر نے وارفتگی سے کہا تھا۔ کچھ دیر تک دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر وہی زندگی جیسی آواز گونجی۔

"تم کچھ بھی کہو میرا فیصلہ وہ ہی ہے اور ویسے بھی میں نے کہا نا کہ میری پسند اور نہ پسند کی بات ہے!"

"تمہاری پسند یا نہ پسند کی بات ہوتی تو میں ضرور مان بھی لیتا مگر اب یہ پسند' نہ پسند کی بات نہیں ہے بلکہ "محبت" کی بات ہے! ہماری "محبت" کی! اور تم چاہے کچھ بھی کہو یا کر لو میں تمہیں "محبت" سے مکرنے تو نہیں دوں گا میری ضد اور جنون سے تم اچھی طرح واقف ہو!" عمر نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے! تم مجھے خود ہی چھوڑ دو نہیں تو میں پھر دوسرا راستہ اختیار کروں گی۔"

دوسری طرف سے اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔ عمر کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے اسی مضبوطی سے کہا۔

"ٹھیک ہے تمہاری ہر بات کو سچ مان لوں گا۔ جو کہو گی' وہ ہی کروں گا! بس ایک بار میرے سامنے آ کر' میری آنکھوں میں دیکھ کر' میرے دل پہ ہاتھ رکھ کر کہہ دینا! خدا کی قسم اگر اس کے بعد یہ دل دھڑکا تو میں مان جاؤں گا کہ "محبت" کا وجود' اس دنیا میں ہے ہی نہیں! میں آ رہا ہوں تمہارے پاس' تمہارا جواب لینے یا تو تمہیں لاجواب کر کے آؤں گا یا پھر خود کو ہمیشہ کے لیے ہار کر!

"میں آ رہا ہوں پری! میرا انتظار کرنا...."

میری مٹی کو چمکنا ہے تیرے نور کے ساتھ
تو میری خاک سے بچ کر نہیں جانے والا

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی عمر نے فون بند کر دیا تھا۔ مگر اس کی سرخ رنگ ہوتی آنکھوں میں ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرنے کے نشان تھے۔

☆ ☆ ☆

صبح سے ہی آسمان پہ کالے گھنے بادلوں کا بسیرا تھا۔ ہوا کی موج مستی الگ جاری تھی۔ چار سالہ انوشے بڑے سے لان میں ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھی۔ ماہ رخ بھی خوشگوار موڈ میں سب کچھ بھلائے' انوشے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ جب چوکیدار نے گیٹ کھول کر کسی کو اندر آنے دیا تھا۔ آنے والا سمیر تھا۔ ماہ رخ کو لان میں دیکھ کر وہ بھی اس طرف ہی آ گیا اور آگے بڑھ کر بھاگتی ہوئی انوشے کو گود میں اٹھا لیا۔

"کل میں واپس لاہور جا رہا ہوں۔ سوچا جاتے ہوئے ایک بار انوشے سے مل لوں۔ بہت پیاری بچی ہے آپ کی۔"

سمیر نے پہلے کی نسبت سنجیدگی سے کہا۔ وہ کافی حد تک ماہ رخ کی مجبوریوں کو سمجھنے لگا تھا۔ دوسری بات جہانگیر نے بھی' اپنے رویے یا مزاج کو چھپانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔ ماہ رخ نے سر اٹھا کر سنجیدہ سے سمیر کی طرف دیکھا تھا۔

"اس دن آپ بغیر کھانا کھائے چلے گئے تھے۔ آج کم از کم چائے تو ضرور پی کر جائیے۔ آئیے پلیز!"

ماہ رخ نے آداب میزبانی نبھاتے ہوئے اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ جہانگیر بھی گھر پہ موجود تھا۔ ماہ رخ جانتی تھی کہ جہانگیر حسب عادت برا منانے لگا۔ مگر وہ اپنی نیت اور عمل میں صاف تھی۔ اس لیے آداب میزبانی نبھانے کے لیے اسے کسی عذر کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو انوشے 'سمیر کی گود سے اتر کر' صوفے پہ پڑے اپنے بڑے سے ٹیڈی بیئر کی طرف بھاگی تھی۔ سمیر ادھر ہی رک گیا تھا اور مسکراتے ہوئے انوشے کو دیکھنے لگا۔

اسی وقت ماہ رخ 'اس کے پاس سے گزر کر کچھ آگے ہی گئی تھی جب اسے بہت زور کا چکر آیا اور بے اختیار ہی اس نے اپنی خادمہ رضیہ کو آواز دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ تیورا کر گرتی 'سمیر نے اسے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور اسی وقت سیڑھیاں اترتے جہانگیر نے 'ماہ رخ کو چکراتے اور سمیر کو اسے تھامتے دیکھ لیا تھا۔ جب تک جہانگیر تیزی سے سیڑھیاں اترتے نیچے پہنچا سمیر 'ماہ رخ کو پاس پڑے صوفے پہ بیٹھا چکا تھا۔ رضیہ بھی ماہ رخ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ سمیر پریشان سا ایک قدم پیچھے پلٹا جب اس کے منہ پر زور سے طمانچہ پڑا۔ سمیر لڑکھڑا کر رہ گیا اور حیرت و صدمے سے اپنے سامنے کھڑے جہانگیر کو دیکھنے لگا۔ جو غصے سے پھنکارتے 'نفرت بھری نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ "تمہاری جرات کیسے ہوئی میری بیوی کو ہاتھ لگانے کی۔"

جہانگیر نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ جہانگیر کے منہ سے نکلے لفظوں کے زہر سے سمیر کا تن من نیلا ہو گیا تھا۔ جبکہ ماہ رخ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس تماشے کو دیکھ رہی تھی۔

"اپنی زبان سنبھال کر اور سوچ سمجھ کر لفظ استعمال کیا کریں۔ ضروری نہیں ہے کہ سب آپ کی طرح چھوٹے ذہن کے مالک ہوں جو اپنے اندر کی غلاظت 'دوسروں میں دیکھتے پھرتے ہیں!"

سمیر نے ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتے ہوئے سرخ چہرے اور مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے کہا اور ماہ رخ کے پیلے پڑتے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"سوری ماہ رخ آپی! مجھے اتنا اندازہ تو تھا کہ آپ کے شوہر کا مزاج بہت سخت اور روکھا ہے مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ شخص ذہنی بیمار اور شکی بھی ہے!"

سمیر نے نفرت سے جہانگیر کی طرف دیکھ کر زمین پہ تھوکا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ جہانگیر نے بھی پاس پڑی شیشے کی میز کو زور سے ٹھوکر ماری اور غصے سے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ میز دھماکے سے کانچ کے ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔ ماہ رخ 'ارد گرد کی ہوش بھلائے 'ہر طرف بکھرے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کانچ کے ٹکڑے کون سے ہیں اور اس کی ذات کے کون سے! انوشے کب سے ڈر کے رو رہی تھی۔ ایک خادمہ اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی وہاں سے لے جانے لگی۔ مگر وہ لپک لپک کر ماں کے پاس جانا چاہ رہی تھی۔ مگر ماہ رخ وہاں ہوتی تو کچھ سنتی یا محسوس کرتی اس کا وجود شک اور تذلیل کے الاؤ میں جل رہا تھا۔ نیک اور پاکباز عورت سب کچھ برداشت کر بھی لے مگر اپنے کردار پہ اٹھی انگلی کبھی بھی نہیں برداشت کرتی ہے۔ یہاں آکر مصلحت 'سمجھوتے کی ساری راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک مرد 'اپنی بیوی کو محبت نہ دے تو بھی گزارا بہت آرام سے ہو سکتا ہے۔ مگر اپنی بیوی پہ بھروسہ نہ کرے 'اس کی تذلیل کرے' ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزارنا 'جیتے جی آگ میں جلنے کے مترادف ہے اور آگ بہت ظالم ہوتی ہے۔ اس میں جانا اور رہنا 'عذاب ہوتا ہے اور زندگی میں جب اس کی رحمت کی امید ہمیشہ رہی ہے تو عذاب کی سزا کیوں بھگتیں!

اس لمحے ماہ رخ نے بھی ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ محبت نہ سہی مگر اپنے وجود کی تذلیل بھی اسے منظور نہیں تھی۔ موسلا دھار اور برستی رات 'آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب جہانگیر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا اور سامنے بیڈ پہ بکھری ـــ اور سرخ آنکھوں کے ساتھ بیٹھی ماہ رخ اسے اندر آتا دیکھ کر بیڈ

سے اتر کر چھوٹے چھوٹے مگر مضبوط قدم اٹھاتی اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا دوپٹا ایک طرف سے نیچے قالین پہ لٹک رہا تھا۔ اس کا چہرہ پتھریلا مگر رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ جہانگیر نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پہلی بار ہی اسے اس روپ میں دیکھا تھا۔ ایک قیامت تھی جو گزر چکی تھی اور ایک قیامت تھی جو ان دونوں کے درمیان کھڑی تھی۔ جس سے دونوں ہی بے خبر تھے۔

سوال کرنے والا بھی اور جواب دینے والا بھی...!

وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے سامنے ایسے ہی کھڑے تھے!

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا ہے علشبہ تم ایسے اچانک سے واپس کیوں جا رہی ہو؟ ابھی یونیورسٹی میں کلاسز بھی شروع نہیں ہوئی ہیں کل ہی تو تم نے مجھے بتایا تھا پھر آج ایسے ہی کیوں؟"

انوشے پریشانی سے علشبہ سے پوچھ رہی تھی جو جلدی جلدی بیگ میں اپنی چیزیں رکھ رہی تھی۔ علشبہ کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ وہ انوشے کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ انوشے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اچانک علشبہ کو کیا سوجھی۔ کل رات تک دونوں نے باتیں کی تھیں اس وقت علشبہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی! صبح ناشتے کے بعد بابا جان نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا اور ان کے آفس جاتے ہی علشبہ نے واپس جانے کی ضد پکڑ لی تھی۔ فون کر کے وہ اپنی سیٹ ریزرو کروا چکی تھی۔

"علشبہ بتاؤ مجھے آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟" انوشے نے جھنجلا کر علشبہ کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔ علشبہ کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی وہ چونک گئی۔

"تم رو رہی ہو؟" انوشے نے اس کے چہرے پہ پھیلے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں بس امی بہت یاد آ رہی تھیں۔ کل رات انہیں خواب میں دیکھا تو رہا نہیں گیا۔ میں نے ماموں جان کو بھی بتا دیا تھا۔ تم پریشان نہ ہو۔ بس کچھ دیر میں میری فلائٹ ہے۔ مجھے یہاں آئے دن بھی تو کافی ہو گئے تھے نا! اس لیے..."

علشبہ نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بیگ کی زپ بند کی۔ اور ڈریس تبدیل کرنے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ انوشے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اچانک! مگر..." انوشے کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ علشبہ کا رویہ بہت عجیب سا تھا۔ انوشے، علشبہ کو سی آف کر کے واپس آئی تو بہت چپ چپ تھی۔ ایئرپورٹ پہ علشبہ بے اختیار انوشے کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"جہانگیر! آپ جانتے ہیں میں آج تک کیوں آپ کی بے اعتنائی، کج ادائی، بے رخی کو برداشت کیا؟ کبھی سوچا کیوں ایک عورت، اپنا گھر بسانے اسے بسانے کے لیے، اپنے جان سے پیارے رشتوں کو چھوڑ کر، ایک اجنبی کے سنگ زندگی گزارنے کا عہد کرتی ہے! کبھی سوچا اگر ایک عورت اتنی قربانی دیتی ہے تو کیوں اور کس لیے؟"

ماہ رخ نے ٹوٹے بکھرے لہجے میں سامنے کھڑے جہانگیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بارش کا شور اور بجلی کے کڑکنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

"صرف ایک گھر بسانے کی خواہش میں وہ خواہش جو آدم اور حوا کو بھی تھی۔ اسی خواہش کے تحت تو ناممکن نظر آنے والے مرحلے بھی طے کر لیے جاتے ہیں اور اگر شادی کے بعد ایک عورت کو اس کے شوہر کی طرف سے محبت، عزت اور مان ہی نہ ملے تو؟ کیا مرد و عورت کا رشتہ صرف حقوق و فرائض کی حد تک ہی رہ جاتا ہے؟ چلیں اس بات کو بھی اگر سامنے رکھا جائے تو کیا ہمارے مذہب میں بیوی کے صرف فرائض ہی بتائے گئے ہیں۔ حقوق نہیں!

مرد اللہ اور اس کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ
وسلم کو گواہ بنا کر جب کسی عورت کو اپنی زندگی میں
شامل کرتے ہیں تو کیا اس کی تذلیل کرنے کے لیے؟"
ماہ رخ نے بپھرے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو تم! میں نے تمہیں کونسی تنگی
دے رکھی ہے۔ ہر طرح کا آرام اور بہتر زندگی مہیا کی
ہے۔" جہانگیر نے تپتے ہوئے کہا۔

"جسمانی سکون کی اہمیت اس وقت ختم ہو جاتی ہے
جہانگیر صاحب! جب آپ ہر لمحہ ہر پل سامنے والے کو
ذہنی اذیت دیں۔ اسے مینٹل ٹارچر کریں۔"

ماہ رخ نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ آج اس کے ضبط
کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ناجائز بات کے آگے جھکنا '
اسے تسلیم کرنے کے برابر تھا اور ماہ رخ جیسی باکردار
اور شریف عورت کے لیے 'یہ ایک گالی کی طرح تھا۔

"ماہ رخ میرا دماغ خراب مت کرو اور اپنی حد میں
رہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے بحث کرنے اور
زبان درازی کرنے والی عورتوں سے سخت نفرت ہے
!" جہانگیر نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی تھی۔

"بات بحث یا زبان درازی کی نہیں ہے بات میری
عزت نفس اور نسوانیت کی ہے۔ جس پہ آج آپ
نے سب کے سامنے انگلی اٹھائی ہے۔ آپ اپنی اس
حرکت کے لیے میرے آگے جواب دہ ہیں اور مجھے اس
کا جواب چاہیے کیوں! آپ نے مجھے 'میری ہی
نظروں میں گرا دیا؟ کیوں! اپنی گندی سوچ کے چھینٹے '
میرے پاک دامن پہ اڑائے؟ کیوں جہانگیر؟"

ماہ رخ نے جہانگیر کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے
سوال کیا۔ یکایک جہانگیر کا ہاتھ اٹھا اور ماہ رخ لڑکھڑا کر
رہ گئی۔ اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھے وہ حیران اور پھٹی پھٹی
نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ تمہارے ہر سوال کا جواب ہے اور بس اپنی
حرکت پہ نہ کل شرمندہ تھا اور نہ آج ہوں۔ وہ تھا ہی
اسی قابل اور تم۔۔۔"

جہانگیر نے نفرت بھرے لہجے میں کہتے انگلی اٹھا کر
پتھرائی ہوئی کھڑی ماہ رخ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم یہ جانتی بھی تھیں کہ مجھے اس کا یہاں آنا
سخت ناپسند ہے۔ پھر بھی تم نے اسے گھر کے اندر آنے
کی دعوت دی اور اسے تو موقع چاہیے تھا تم ذرا سا چکرا
کیا گئیں وہ فوراً" سے پہلے تمہیں سنبھالنے کے بہانے
تمہارے قریب ہوا تھا اور۔۔۔"

"بس کریں جہانگیر! خدا کا واسطہ ہے ایک معمولی
سے ہوئے حادثاتی واقعے کو اپنی مرضی کا رنگ مت
دیں۔ مجھے میری ہی نظروں میں مت اتنا گرا دیں کہ
میں دوبارہ آپ سے نظر نہ ملا سکوں۔"

ماہ رخ نے روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ
دیے اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت بری
طرح اور ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ جہانگیر نے
ناگواری سے ماہ رخ کو بلکتے ہوئے دیکھا اور تنفر سے
اونہہ کہہ کر رخ دوسری طرف موڑ لیا۔

کچھ دیر بعد ماہ رخ اٹھی اور اپنے آنسو پونچھتی ہوئی '
مضبوط قدم اٹھاتی ' جہانگیر کے پاس سے گزر کر کمرے
کے داخلی دروازے کے پاس پہنچی اور مڑے بغیر
سنجیدگی سے بولی۔

"جہانگیر! مجھے لگا تھا کہ میں آج آپ کے اندر
سوئے ہوئے احساس کو اتنا تو ضرور جگا دوں گی کہ آپ
اپنی آج کی حرکت پہ شرمندہ ہوں مگر یہ میری خام خیالی
ہی رہی۔ مجھے آج سمجھ آئی کہ میں ایک پتھر کے ساتھ
رہ رہی تھی۔ اگر بات میرے کردار اور عزت نفس پہ
نہ آتی تو میں ساری عمر اسی خاموشی سے اندر ہی اندر
ٹوٹتے ہوئے گزار دیتی مگر اب نہیں!"

ماہ رخ نے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے ذرا سا مڑ کر جہانگیر کو
دیکھا۔ جہانگیر بھی ماہ رخ کے آخری جملوں پہ چونک کر
اسے گھورنے لگا تھا۔

"جہانگیر! جب تک آپ کو اپنی زیادتی ' اپنے غلط
رویے کا احساس نہیں ہو جاتا ' میرا یہاں سے چلے جانا
ہی بہتر ہے۔"

ماہ رخ نے کہا اور مڑ کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر
نکل گئی۔ پیچھے غصے سے پیچ و تاب کھاتا ' جہانگیر کچھ
خیال آتے ہی فوراً" کمرے سے باہر نکلا۔ جہانگیر کا رخ

انوشے کے کمرے کی طرف تھا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ ماہ رخ‘ سوئی ہوئی انوشے کو خود سے لپٹا کر پیار کر رہی تھی۔ چوم رہی تھی۔

”تم نے جہاں جانا ہے دفع ہو جاؤ مگر یہ یاد رکھنا میری بیٹی کبھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ میں بھی تمہاری جیسی عورت کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ صبح ہوتے ہی ڈرائیور تمہیں‘ تمہاری ماں کے گھر چھوڑ آئے گا۔ جو چاہو یہاں سے لے کر جا سکتی ہو سوائے انوشے کے‘ اور یہاں سے ایک بار جاؤں کی تو واپسی کے سب راستے تمہیں بند ملے گے۔“

جہانگیر نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی تھی۔ ماہ رخ آزردگی سے مسکرا دی اور سوئی ہوئی انوشے کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں انوشے کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہوں؟“

ماہ رخ نے پراسرار سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے‘ جہانگیر کے الجھن بھرے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

”انوشے کو میں اپنی رضا اور خوشی سے آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ کیوں؟ اس کا جواب آپ خود ڈھونڈیں گے۔ نہیں تو وقت ہے نا ہر سوال کا جواب دینے والا آپ بھی انتظار کریں۔ اس وقت کا‘ جب بہت سی ان کہی باتوں کے اسرار کھلیں گے۔“

ماہ رخ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تو جہانگیر کچھ نہ سمجھتے ہوئے‘ دروازہ غصے سے مارتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ رات ماہ رخ نے رو کر اور انوشے کو خود سے لگا کر گزاری تھی۔ آج اس کی ممتا بھی‘ اسے اپنے فیصلے سے باز نہیں رکھ پا رہی تھی۔ اس کا دل اپنے فیصلے پہ مطمئن تھا۔ مگر انوشے کو خود سے الگ کر دینے کا خیال اسے کمزور بھی بنا رہا تھا۔

مگر وہ جانتی تھی کہ یہ ابتدا ہے آج جہانگیر نے سمیر کو لے کر‘ اس کے کردار پہ انگلی اٹھائی تھی۔ کل کو کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ جہانگیر کو اپنے رویے یا اپنے عمل پہ کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ ایسے شخص کے ساتھ رہنا خود اپنی نظروں میں ہی گرنے کے مترادف تھا۔

اگلی صبح ماہ رخ نے خاموشی سے وہ بڑی‘ عالیشان حویلی چھوڑ دی تھی۔ ڈرائیور نے اسے بحفاظت لاہور پہنچا دیا تھا۔ ام کلثوم نے جب لٹی پٹی سی ماہ رخ کو گھر کی دہلیز پہ دیکھا تو دل تھام کر رہ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

”یہ لیجیے بابا جان! آپ کی پسندیدہ کافی“ انوشے نے کمرے کا دروازہ کھول کر آتش دان کے پاس‘ ایزی چیئر پہ بیٹھے کتاب پڑھتے ہوئے بابا جان کے پاس آتے ہوئے کہا۔ بابا جان جب سے ایبٹ آباد سے آئے تھے۔ بہت خوش اور مطمئن سے تھے۔ کافی کا مگ پکڑ کر انہوں نے لبوں سے لگایا۔ کافی کی مہک اور ذائقے نے ان کے مزاج کو اور خوشگوار کر دیا۔

”یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو!“ بابا جان نے انوشے کو پیار سے اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا تو انوشے ان کے قدموں کے پاس کشن پہ بیٹھتے ہوئے اپنی کہنیاں ان کے گھٹنوں پہ ٹکا کر‘ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی پہ چہرہ ٹکا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس لمحے‘ وہ بہت معصوم سی لگی تھی بابا جان کو۔ یہ انوشے کی بچپن کی عادت تھی۔ بابا جان کے ساتھ اسی انداز میں بیٹھ کر کہانیاں سننا‘ اپنی باتیں کرنا‘ بابا جان کو بولتے ہوئے دیکھتے رہنا۔ ابھی بھی وہ منتظر نظروں سے بابا جان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جن کے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیاں واضح تھیں۔ کافی ختم کرنے تک ان کے درمیان خاموشی رہی۔ پھر بابا جان گلا کھنکار کر گویا ہوئے۔

”میں نے ایبٹ آباد جانے سے پہلے علشبہ کو ایک ذمہ داری سونپی تھی مگر تم بتا رہی تھیں کہ اس کا اچانک ہی واپس جانے کا پروگرام بن گیا اور وہ بغیر کچھ کہے یا بتائے چلی گئی۔ خیر!“ بابا جان نے تمہید باندھتے ہوئے کہا تو انوشے چونک سی گئی۔

”کیسا کام بابا جان؟“ انوشے نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

”انوشے‘ بڑی آپا نے ہمدان کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے مگر ساتھ ہی ان کی خواہش تھی کہ ایک بار تم

سے پوچھ لیا جائے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ میری بیٹی کے
شب و روز میرے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ تم
نے آج تک مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے مگر پھر
بھی' میں نے مناسب سمجھا کہ علشبہ دوست یا بہن
بن کر تمہاری رضا معلوم کرے۔ مگر وہ بھی چلی گئی
ہے۔ میں ایبٹ آباد بھی اسی سلسلے میں ہی گیا تھا۔
اگلے جمعے کو بڑی آپا آرہی ہیں باقاعدہ تمہارا رشتہ لینے
سب کے ساتھ۔ میں انہیں ہاں کر آیا ہوں۔" جہانگیر
نے خوشی خوشی سے بتاتے ہوئے کہا۔ تو انوشے بھیگی
آنکھوں اور زرد چہرے کے ساتھ ایک دم سے پیچھے
ہٹی تھی۔

"کیا ہوا انوشے! کیا تمہیں اعتراض ہے اس رشتے
پر۔" بابا جان نے اسے سر جھکائے اور پیچھے ہٹتے دیکھ کر
سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

"نہیں نہیں بابا جان! بس ویسے ہی مما کا خیال آگیا
تھا۔ آپ کو جو بہتر لگے آپ کریں۔" انوشے نے تیزی
سے پلکیں جھکاتے ہوئے اور کانپتی آواز میں کہا تھا۔

"جیتی رہو بیٹا! تم نے میرا مان رکھ لیا۔" بابا جان
نے انوشے کے جھکے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ انوشے
شب خیر کہتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی اور
تیزی سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے' پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ بابا جان نے ہمیشہ
اپنی مرضی کی تھی۔ اس کی شادی کا فیصلہ بھی ایسا ہی کرنا
تھا انہوں نے' وہ سب جانتی تھی مگر کسی چیز کے جاننے
اور اس کے بیتنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آج
اس فیصلہ کن مرحلے پہ آکر اس کے قدم لڑکھڑا گئے
تھے۔ علشبہ اس دن واپس لاہور کیوں چلی گئی تھی
اب انوشے کی سمجھ میں آیا تھا۔ علشبہ' ہمدان سے
محبت کرنے لگی تھی۔ اس کا اندازہ انوشے کو پہلے ہی ہو
گیا تھا۔ اسی لیے اس میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ
اپنی محبت کو کسی اور کے ہاتھ میں سونپ دیتی۔ اسی لیے
اس نے فرار کو آسان سمجھا تھا۔ مگر انوشے کیسے اور
کہاں فرار حاصل کرتی؟

"مما! آئی مس یو سو مچ! کاش آپ آج میرے پاس
میرے ساتھ ہوتیں۔ میں تھک گئی ہوں آپ سے
کیا عہد نبھاتے نبھاتے! مما آپ کی انوشے اتنی بہادر
نہیں ہے۔"

انوشے نے گھٹنوں میں سر دے کر روتے ہوئے
ماں کو پکارا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماہ رخ کو آئے دس دن گزر چکے تھے۔ سمیر کی زبانی
مریم پہلے ہی ساری صورت حال سے واقف ہو چکی
تھی۔ مریم نے اس بات کو لے کر گھر میں کافی ہنگامہ کیا
تھا۔ سمیر چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور چہیتا
تھا اس کے ساتھ کیے سلوک اور الزام نے سب کو
شدید غصہ اور طیش دلا دیا تھا۔ ماہ رخ کو اپنے سامنے
دیکھ کر مریم نے کافی ہنگامہ کیا تھا۔ جنید کو بھی جہانگیر
کے رویے نے شدید تکلیف پہنچائی تھی مگر لاڈلی اور
اکلوتی بہن کی حالت دیکھ کر اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

جہانگیر کی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود اس
سے اس ذلالت کی توقع نہیں تھیں ان کو۔ ماہ رخ بہت
نڈھال' اور غم زدہ سی رہتی تھی۔ جہانگیر کی ہٹ دھری
اور بے رخی' انوشے سے جدائی' کبھی کبھی اسے لگتا تھا
کہ اس نے سنگین غلطی کی تھی اپنا گھر چھوڑ کر۔ مگر پھر
اس شام کا وہ منظر اور جہانگیر کے زہریلے الفاظ' اسے
مضبوط کر دیتے تھے۔ ام کلثوم جنہوں نے ساری زندگی
مضبوطی اور بہادری سے گزاری تھی۔ ماہ رخ کو دیکھ کر
وہ بھی اندر سے ڈھے چکی تھیں۔ وہ جہانگیر سے بات
کرنا چاہتی تھیں۔ مگر انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ
اس سے کس چیز کی وضاحت مانگیں؟ جہانگیر کے غلط
رویے یا الزام کی یا اپنی بیٹی کی معصومیت اور پاکدامنی
کی گواہی دیں؟ یا اسے یہ بتائیں کہ سمیر لاابالی ضرور
ہے مگر بری نیت رکھنے والا نہیں۔ وہ ماہ رخ کو آپی کہتا
تھا۔ جو جہانگیر نے سمجھا وہ اس کے ذہن کا فتور تھا۔ سمیر
کی نیت کا نہیں!

اسی کشمکش میں پندرہ دن گزر گئے۔ ایک دن ڈاک
کے ذریعے ماہ رخ کے نام رجسٹری آئی تھی۔ جسے پڑھتے

ہی وہ تیورا کر گر پڑی تھی۔ مریم نے اسے بے ہوش دیکھ کر' جنید کو آواز دی اور اسے گاڑی میں ڈال کر قریبی ہاسپٹل لے گئے۔ جہاں اسے ایمرجنسی میں کئی گھنٹے رکھا گیا۔ ماہ رخ کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور سب سے زیادہ تکلیف دہ خبر جو اسے ہوش میں آنے کے کئی دن بعد پتا چلی تھی وہ یہ کہ وہ امید سے تھی۔ مگر اس کا مس کیرج ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے وجہ شدید دباؤ اور کوئی صدمہ بتائی تھی۔ جہانگیر نے ماہ رخ کو طلاق دے دی تھی۔ یہ خبر قیامت بن کر ان کے گھر پہ ٹوٹی تھی۔ احسن بھائی اور زارا کے کئی فون آئے تھے۔ احسن بھائی جلد از جلد پاکستان آنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

ماہ رخ اسپتال میں ہی ایڈمٹ تھی جب اس سے ملنے جہانگیر کی بڑی بہن کنیز فاطمہ آئی تھیں۔ ام کلثوم کی زبانی' ماہ رخ کے ساتھ بیتے جانے والی روداد اور مس کیرج کا سن کر وہ بہت غم زدہ اور آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ ماہ رخ کا ہاتھ تھام کر وہ کتنی دیر ہی روتی رہیں اپنے بھائی کی طرف سے معافی مانگتی رہیں۔ جواب میں ماہ رخ خاموش رہی۔ بولی تو صرف اتنا۔

"میری انوشے کا خیال رکھیے گا۔ اگر زندگی میں اسے کبھی آپ کی ضرورت پڑی تو انکار مت کیجیے گا۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہو گا۔"

ماہ رخ نے دھیرے سے بول کر آنکھیں موندلی تھیں۔ مگر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے تھے۔ کنیز فاطمہ بہت دکھی دل سے وہاں سے آئی تھیں۔

جہانگیر نے اسلام آباد میں بہت خوب صورت گھر لے لیا اور مستقل وہاں رہائش اختیار کر لی۔ اور پونے پانچ سال کی ڈری سہمی سی انوشے کو اسکول میں داخل کروا دیا۔ ایبٹ آباد میں موجود بڑی سی حویلی کو ریسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا گیا اور ان دنوں جب جہانگیر حویلی میں مختلف تعمیری کام کروا رہا تھا۔ ایک دن کنیز فاطمہ اس سے ملنے چلی آئیں۔

"آئیے آپا! میں بس کچھ دیر میں اسلام آباد کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔" جہانگیر نے انہیں دیکھ کر سامنے پڑے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پچھلے آٹھ مہینے سے وہ جہانگیر سے بات کرنے کا موقع تلاش کر رہی تھیں۔ مگر جہانگیر نے کسی سے بھی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود سے بھی بھاگ رہا تھا۔

"حیرت کی بات ہے تمہارے جیسے بے حس اور خود غرض شخص کو بھی کوئی رشتہ یاد رہ گیا ہے۔ ماہ رخ کو تو تم نے اپنی زندگی سے ایسے نکال کر پھینک دیا جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں' بے جان مورت تھی۔ تم نے تو یہ بھی نہیں سوچا کہ انوشے کا کیا ہو گا؟ وہ معصوم سی بچی کیسے ماں کی جدائی کا صدمہ سہے گی۔"

اتنے مہینوں کا پکتا لاوا جہانگیر کو سامنے دیکھ کر پھٹ پڑا تھا۔ کنیز فاطمہ نے کبھی جہانگیر سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ بڑی ہو کر بھی' بھائی سے دبتی تھیں۔ مگر ماہ رخ کے ساتھ ہوئی زیادتی نے انہیں بولنے کی طاقت دے دی تھی۔

"کنیز آپا! بس کریں۔ یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ میں مزید اس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ جس کے نزدیک میری بات' میرے وقار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔" جہانگیر نے ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔

"بس کرو جہانگیر! اپنی جھوٹی انا' ضد' خود سری کے بت توڑ دو۔ ماہ رخ جیسی عورت کی تم نے قدر نہیں کی۔ جو تمہارے ساتھ اپنے ہر عمل' سوچ اور رشتے سے خالص تھی۔ تم نہیں جانتے تم نے کیسا ہیرا گنوایا ہے۔ اپنی ضد' غصے اور جلد بازی کی وجہ سے! ارے ناوان! کچھ اور نہ سہی اپنی معصوم بچی کی طرف تو دیکھتے' اتنا بڑا فیصلہ کرتے وقت' اپنے آنے والے بچے کے بارے میں تو سوچتے۔ تمہارے اس ظلم نے اس کی کوکھ بھی اجاڑ دی۔ ایک بار تو سوچتے تم کیا کر رہے ہو؟"

کنیز فاطمہ نے روتے ہوئے کہا تو جہانگیر پتھر کا بت بنا رہ گیا۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں کنیز آپا؟ اس کے ذہن میں مختلف خیالات چکرانے لگے تھے۔ اس کے ماتھے پہ پسینہ نمودار ہو گیا تھا۔ اس نے بے اختیار صوفے کی

پشت تھام کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔

"کیا ماہ رخ پریگننٹ تھی؟" جہانگیر نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا تو کنیز فاطمہ نے چونک کر ان کے پیلے پڑے چہرے کو دیکھا تھا۔

"ہاں! مگر اسے بھی خبر تب ہوئی جب وہ سب کچھ ہار کر تہی دامن ہو چکی تھی۔" کنیز فاطمہ نے آہستہ آہستہ کر کے' ماہ رخ کے نروس بریک ڈاؤن سے لے کر اسپتال میں ہوئی آخری ملاقات تک کی روداد سنا دی۔ جہانگیر گم صم سا سب سنے گیا۔

"یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟" پچھتاوے کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔

"میری تم سے ایک التجا ہے' تمہیں بے جی کا واسطہ ہے ماہ رخ پہ اور ظلم مت کرنا۔ اسے انوشے سے دور مت کرنا۔ تم پہلے ہی بہت ظلم کما چکے ہو۔" کنیز فاطمہ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے ایک نظر گم صم سے کھڑے جہانگیر پہ ڈالی تھی اور خاموشی سے دہلیز پار کر گئیں۔ شام کی بڑھتی تاریکی نے' رات کے دامن کو تھام لیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ مگر صوفے پہ گم صم سے' سود و زیاں کے حساب سے گزرتے جہانگیر کے اندر ہر چیز روشن ہو گئی تھی۔

"بے جی کا واسطہ! اور ظلم مت کمانا؟" تو کیا میں اتنا ظالم اور سنگ دل ہوں کنیز آپا نے مجھے بے جی کی قسم دی۔ کیا وہ جانتی نہیں کہ مجھ میں انسان ہونے کے ناطے' انسانیت نہیں ہوگی؟ کیا سچ میں' میں اپنے ظلم میں فرعون بن چکا ہوں؟"

جہانگیر نے اپنے اندر کے سوالوں سے گھبرا کر باہر کا رخ کیا۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ جگہ بدل لینے سے' سوال دم نہیں توڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اور زیادہ شدت سے سامنے آنے لگتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

پرسکون ریسٹورنٹ کے تنہا اور الگ سے کونے میں بیٹھی انوشے بار بار رسٹ واچ کو دیکھ رہی تھی۔ بلیک رنگ کی گھیرے دار فراک پہ ہرے اور میرون رنگ کے نفیس سی کڑھائی تھی۔ کندھوں پہ میرون رنگ کی ہی شال تھی۔ سبز آنکھوں میں پھیلے ہلکے گلابی پن کے کنارے پہ کاجل کی لکیر واضح تھی۔ جیسے پرسکون سے جھیل کے گرد حصار سا بندھا ہو۔ بال حسب معمول کیچر میں جکڑے کچھ پشت پہ بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ لٹیں چہرے کے گرد ہالہ سا بنا رہی تھیں۔ ستواں ناک میں چمکتی لونگ اور تراشیدہ ہونٹوں پہ (گلابی) پنک کلر کے لپ گلوس نے اس کے روپ کو مزید نکھار دیا تھا۔

ہمدان نے ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے ادھر سے ادھر نظریں دوڑائی تھیں کہ وہ اسے نظر آ ہی گئی۔ وہ انوشے کو اکیلے وہاں بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اپنے ساتھ آئے دوست سے معذرت کرتا' وہ بہت سرشار قدموں سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ جب سے اسے پتا چلا تھا کہ ماموں جان بھی دل و جان سے اس رشتے پہ راضی ہیں۔ ہمدان کا دل نئی لے اور ترنگ پہ دھڑکنے لگا تھا۔

اور آج اتفاقاً" انوشے کو یہاں اکیلا بیٹھے دیکھ کر' اسے اپنی خوش بختی پہ یقین آ گیا تھا اور انوشے سے اپنے دل کی بات کہنے کا اسے بہترین موقع ملا تھا اور اس کے دل کی بات جاننے کا بھی! ان کچھ لمحوں میں ہی اس کے خوش گماں دل نے' کتنے ہی خواب سجا لیے تھے۔ ہمدان کے چہرے کی چمک اور آنکھوں میں' آنے والے لمحوں کا خوشگوار تصور اس کی اندرونی خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور آج تو انوشے کی بھی سج دھج نمایاں تھی یا ہمدان کو ہی ایسا لگ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ ہمدان اس کی میز تک پہنچتا۔ کوئی اور دراز قد اور چوڑے شانوں والا جس کی پشت ہمدان کی طرف تھی' انوشے کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ چکا تھا اور بہت استحقاق کے ساتھ اپنا مضبوط مردانہ ہاتھ' میز پہ دھرے انوشے کے نازک گلابی ہاتھوں پہ رکھ چکا تھا۔ ہمدان جہاں تھا وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اس کی نظروں کے سامنے انوشے کا روشن چہرہ تھا۔ جو اس نووارد کو دیکھ کر مزید روشن ہو گیا تھا۔

اور کچھ چہرے تب ہی روشن ہوتے ہیں' جب کسی سے

دل کا تعلق ہو اور انوشے کے چہرے پہ جھجک آمیز خاموشی اور حیا سے آئی لالی نے اُسے بتا دیا تھا کہ آنے والا' انوشے کے دل سے کتنا قریب ہے۔ انوشے اپنا ہاتھ' بھلے ہی پیچھے ہٹا چکی تھی مگر اس کی گھنیری پلکوں کی لرزش' دھڑکنوں میں آئے بھونچال کو عیاں کر رہی تھیں۔

ہمدان خاموشی سے پلٹ گیا۔ مگر ہمدان کو ایسا لگ رہا تھا' جیسے وہ اپنا سب کچھ یہاں ہی ہار کر جا رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

ماہ رخ نے ایک نظر سوئی ہوئی ام کلثوم پہ ڈالی۔ ساری زندگی ہمت اور بہادری سے' وقت اور حالات کا مقابلہ کرنے والی اس کی ماں' اپنی بیٹی کے ساتھ ہوئے تقدیر کے تلخ وار سے لڑتے لڑتے بالا خر ہار ہی گئی تھی۔ اوپر سے مضبوط بنی ام کلثوم' اندر سے وہی خوفزدہ اور اولاد کی تکلیف پہ تڑپ اٹھنے والی ماں ہی تھیں۔

ام کلثوم کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ماہ رخ گم صم سی رہ گئی تھی۔ آج اس کی وجہ سے اس کی ماں اندر ہی اندر سے گھلتی' درو سہتی' اس حال تک پہنچ گئی تھیں۔

"اور اگر امی کو کچھ ہو گیا تو!" ہسپتال کے ٹھنڈے فرش پہ دل تھام کر بیٹھتی' وہ آنے والے وقت سے خوفزدہ تھی۔ وہ بہت بے بس اور لاچار لگ رہی تھی۔ اب جو بھی کرنا تھا' ماہ رخ کو خود ہی کرنا تھا۔

بہت ہمت اور بہادری سے اس نے ان قیامت کی گھڑیوں کو گزارا تھا اور ام کلثوم کے خطرے سے باہر آتے ہی' اس کا سر اپنے رب کے آگے سربسجود ہو گیا۔ جو بے شک اپنے بندوں کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ام کلثوم ڈسچارج ہو کر گھر آ چکی تھیں۔

کل رات کی فلائٹ سے احسن بھائی' بمعہ اپنی فیملی کے آ چکے تھے۔ ماہ رخ کو گلے سے لگا کر بے اختیار رو پڑے تھے۔ ماہ رخ کی اجاڑ زندگی نے ان سب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ مگر ماں کے سامنے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرنا ان کی مجبوری تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ ام کلثوم کو ذہنی دباؤ سے دور رکھیں۔ زارا اور احسن بھائی نے ماہ رخ کو بہت تسلی دینے کے ساتھ ساتھ اس کا حوصلہ بھی بڑھایا تھا۔ احسن بھائی اور ان کی فیملی کے آنے سے گھر میں ویسے ہی رونق ہو گئی تھی۔ احسن کا ایک ہی بچہ تھا اور زارا دوسری بار ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ کچھ مہینے کے بعد ہی اس کی ڈلیوری متوقع تھی۔

ماہ رخ' ماں کو سوتا ہوا دیکھ کر چپکے سے کمرے سے باہر چلی آئی۔ زارا بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔

ماہ رخ خاموشی سے باہر صحن میں نکل آئی اور چھوٹے سے لان کے ساتھ بنی لوہے کی گول سیڑھی جو اوپر چھت کی طرف جاتی تھی۔ وہ کچھ سیڑھیاں چڑھ کر' اوپر والی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ جہاں سے گھر کی دیوار سے باہر سڑک صاف نظر آتی تھی۔ یہاں بیٹھنے کی اصل وجہ سامنے والے گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے بچے تھے۔ ماہ رخ کا دل بہت اداس تھا اور آنکھیں نم تھیں۔ انوشے کو دیکھے' اس سے ملے دس مہینے سے بھی اوپر ہو چکے تھے۔

انوشے کی پانچویں سالگرہ بھی اس دوران گزر چکی تھی۔ اور اب وہ اسکول بھی جانے لگی تھی۔ مگر اس پہلے قدم پہ' اس اہم مرحلے پہ ماہ رخ اپنی بیٹی کے ساتھ نہیں تھی۔ انوشے اور احسن بھائی کے بیٹے میں سوا سال کا فرق تھا۔ انوشے ساڑھے پانچ کی اور وہ پونے سات سال کا تھا۔

اچانک ماہ رخ نے گھر کے سامنے ایک گاڑی رکتی ہوئی دیکھی۔ گاڑی سے نکلنے والی ایک عورت اور بچی کو دیکھ کر ماہ رخ چونک گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ بے اختیار وہ تیزی سے اٹھی اور تیز رفتاری سے سیڑھیاں پھلانگتی گیٹ کے پاس پہنچی اور فوراً" گیٹ کھول کر دوڑتی ہوئی بلیو فراک میں ملبوس بچی کو گلے لگا لیا۔

"میری انوشے' میری جان! میری آنکھیں ترس گئی تھیں تمہیں دیکھنے کے لیے۔" ماہ رخ بے اختیار'

دیوانہ وار کبھی انوشے کا چہرہ چوم رہی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ۔ انوشے بھی ماں سے لپٹ کر بے اختیار رو پڑی تھی۔

"چھوٹی بی بی! یہ انوشے کا سامان ہے۔ انوشے بی بی کو اسکول سے پندرہ دن کی چھٹیاں ہیں اور صاحب نے کہا ہے کہ یہ آپ کے ساتھ گزاریں گی۔ میرے لیے جو آپ حکم کریں میں انوشے بی بی کے ساتھ رکوں یا واپس چلی جاؤں۔"

رحیمہ بی بی نے مودب لہجے میں کہا۔

"نہیں رحیمہ بی بی آپ واپس جائیں۔ انوشے کی دیکھ بھال میں کرلوں گی۔" ماہ رخ نے خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ کہا اور انوشے کا ہاتھ تھام کر اندر جاتے ہوئے 'کچھ یاد آنے پہ رک کر بولی۔

"اور ہاں اپنے صاحب کا شکریہ ادا کرنا۔ جو حق بھی احسان کر کے ادا کرتے ہیں۔"

ماہ رخ کے لبوں پہ بہت آزردہ سی مسکراہٹ تھی۔

رحیمہ بی بی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور مڑ کر واپس چلی گئی۔ ماہ رخ انوشے کا ہاتھ تھامے اندر آئی تو لاؤنج میں احسن بھائی اور زارا دونوں ہی موجود تھے۔ انوشے کو دیکھ کر وہ دونوں بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ ماہ رخ نے انہیں ساری بات تفصیل سے بتادی۔

اسی وقت اندر والے کمرے سے وہ باہر نکل کر آیا تو زارا چونک گئی۔ وہ بھی نئی صورت کو بہت حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ڈیڈ! یہ کون ہے؟" اس نے باپ کی گود میں بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا تھا۔

"ادھر آؤ۔" احسن نے بیٹے کو پاس بلاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہماری پری" ہے اور اپنی مما کی انوشے!"

احسن نے پیار سے بھانجی کو چومتے ہوئے کہا۔ انوشے کو پہلے دن سے ہی ننھیال میں سب پری کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ سوا چھ سالہ عمر نے بہت غور سے اس خوب صورت سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ پریوں والی کوئی بات اسے اس لڑکی میں نظر نہیں آئی تھی 'سوائے اس کے کہ وہ بھی بہت خوب صورت تھی جیسی کہ پریاں ہوتی ہیں۔ مگر ڈیڈ نے کہا تھا تو وہ پھر پری ہی تھی۔

"ڈیڈ! کیا یہ پری میری بھی ہے؟ مگر یہ تو مجھ سے بات نہیں کر رہی ہے اور نہ ہی دوستی!"

عمر نے تنقیدی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے باپ سے شکوہ کیا تو سب ہنس پڑے تھے۔

"ہم آپ کی دوستی کروا دیتے ہیں!" احسن نے ہنستے ہوئے کہا اور دونوں بچوں کو ہاتھ ملانے کو کہا۔ دونوں بچوں نے ہاتھ ملا کر دوستی کی تھی۔ اور پھر کھیلنے میں مگن ہو گئے تھے۔ مگر آنے والے وقت نے ثابت کیا تھا کہ دونوں کے ہاتھوں کا ملنا وقتی نہیں تھا۔ بلکہ ہمیشہ کے ساتھ کے لیے تھا۔

☼ ☼ ☼

انوشے نے ایک نظر عمر کے مضبوط مردانہ ہاتھ پہ ڈالی اور آہستگی سے اپنا ہاتھ کھینچ کر گود میں رکھ لیا۔ اس کے چہرے پہ حیا کی لالی تھی۔ پلکیں لرز رہی تھیں۔ وہ جو سوچ کر آئی تھی کہ عمر کو دو ٹوک الفاظ میں سمجھا کر' ہر رشتہ' ہر ناطہ ختم کر دے گی۔ اب اس کے سامنے آتے ہی سارے الفاظ جیسے کہیں کھو سے گئے تھے۔ دل عجیب لے پہ دھڑک رہا تھا۔ یہ وہ ہی عمر تھا جس کو وہ اپنے بچپن سے جانتی اور دیکھتی آئی تھی۔ جو اس کا بہترین دوست بھی تھا اور ہمدرد کزن بھی اور آج وہ اس کے سامنے خاموش بت بنی بیٹھی ہوئی تھی۔

عمر وارفتگی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ پچھلے کتنے ہی مہینوں کی جدائی' تھکن اور تکلیف کہیں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ اگر کچھ تھا تو سامنے وہ۔ اور صرف وہ...!

وہ نہیں جانتا کہ اسے انوشے سے محبت کب اور کیسے ہوئی تھی کہ وہ محبت خون کے ہر قطرے میں رچ بس گئی تھی۔ انوشے شاید محبت کے اس مقام تک نہیں آئی تھی اس لیے تو بہت آرام سے بچھڑنے کی باتیں کر بھی لیتی تھی مگر عمر کے لیے یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ وہ زندگی جیے اور اس میں انوشے نہ ہو!

جب خاموشی کا وقفہ طویل تر ہونے لگا تو عمر گہری

سانس لیتا کرسی سے پشت سے ٹیک لگا کر گویا ہوا۔

میرے چارہ گر...!
تیری چپ کھلے کہ
ہوا کو اذن سفر ملے
میرے زخم کھل کے گلاب ہوں
یہ جو سانس سانس ہیں وحشتیں
یہ سراب و خواب کی منزلیں
یہ دیے کی لو سی جو آس ہے
تیرا علم ہے...
تو یہ جل بجھے!
مجھے عشق کا یہ صلہ ملے
تیرے ہاتھ روح کی گرہ کھلے!
یہ بدن کے قید سے ہو رہا
تیرا یہ کرم...!
میرے کیمیا...
نہ سوال ہوں'
نہ جواب ہوں
کسی طور ختم عذاب ہوں...!!

"عمر! میں..." انوشے نے لب کاٹتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں انوشے! جھوٹ مت بولنا... میں اتنی دور کا سفر طے کر کے تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تمہاری زبان سے وہ سچ سن سکوں جو ہزاروں مجبوریوں اور مصلحتوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ مجھ سے جھوٹ مت بولنا! میں سب کچھ داؤ پہ لگا چکا ہوں اس بازی میں!"

عمر نے میز پہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے انوشے کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جو حیران اور پریشان نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے عمر کو دیکھ رہی تھی۔

"میں بابا جان کا مان نہیں توڑ سکتی' جو انہیں مجھ پہ ہے!" انوشے نے کانپتی آواز میں اعتراف کیا تھا۔

"مان قائم رکھنے کے لیے' رشتے بھی نہیں توڑے جاتے ہیں انوشے عمر!"

عمر نے سنجیدگی کے ساتھ کہتے ہوئے اسے اپنے اور اس کے درمیان موجود رشتے کی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ انوشے نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"بابا جان کبھی بھی نہیں مانیں گے!" انوشے نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"تم ثابت قدم رہو! سب مان جائیں گے!" عمر نے حل پیش کرتے ہوئے کہا۔ تو انوشے الجھن میں گھری نفی میں سر ہلانے لگی اور ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"انوشے!" عمر نے پیچھے سے پکارا تھا۔ وہ رک گئی مگر مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنے پتھر ہو جانے کا خوف تھا۔

"میں بابا جان سے ملنے آؤں گا بہت جلد میرا انتظار کرنا۔" عمر کی سنجیدہ آواز سنائی دی تھی۔ انوشے نے بھاگتے قدموں سے ریسٹورنٹ کا دروازہ پار کیا تھا۔ اسی دن سے تو وہ خوفزدہ تھی جو آج اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی زندگی کے دو سب سے اہم اور عزیز از جان رشتے' ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے دونوں کے بغیر زندگی گزارنے کا کوئی تصور نہیں تھا اس کے پاس۔

پچھلے کتنے مہینوں سے وہ خود سے لڑی تھی۔ بے تحاشا۔ مگر پھر بھی ہار اس کا نصیب ہی بنی تھی۔ اگر بات محبت کی ہوتی تو شاید وہ اس سے منہ موڑ بھی لیتی۔ مگر وہ عمر کے ساتھ ایک مضبوط رشتے میں بندھی ہوئی تھی۔ جس سے چاہ کر بھی وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو بابا جان کو اپنا منتظر پایا تھا۔ وہ لاؤنج میں اوھر سے ادھر تیزی سے چکر کاٹ رہے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات بہت پتھریلے تھے۔ ماتھے کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ انوشے کو اندر آتا دیکھ کر وہ رک گئے تھے۔ انوشے نے اپنی الجھن میں دھیان ہی نہیں دیا اور سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی جب بابا جان کی سرد آواز گونجی تھی۔

"کون تھا وہ؟" اپنی پشت پہ ابھرتی آواز پہ انوشے ٹھٹک کر رکی تھی اور پلٹ کر بابا جان کے چہرے کی طرف دیکھا تو سہم گئی۔

"ک... کون بابا جان!" انوشے نے ہکلاتے ہوئے پوچھا تھا۔ تو اچانک بابا جان کا ہاتھ اٹھا تھا اور انوشے کے منہ پہ پڑا۔ انوشے اپنے ہی دھیان میں کھڑی پاس پڑے صوفے سے ٹکرا گئی تھی۔

"وہی جس کے ہاتھوں میں تمہارا ہاتھ تھا! جس کے ساتھ ریسٹورنٹ کے الگ تھلگ گوشے میں بیٹھتے ہوئے تمہیں اپنے باپ کی عزت کا کوئی خیال نہیں رہا تھا۔ انوشے! میری تربیت یہ تو نہیں تھی کہ میری بیٹی کسی نامحرم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پہ پارکوں میں بیٹھتی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میرا مان ہو۔ اگر تمہاری کوئی پسند تھی تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟ بولو جواب دو!"

بابا جان نے غصے سے دھاڑتے ہوئے صوفے کے کنارے پہ ٹکی 'حیرت و صدمے سے' زرد چہرے کے ساتھ بیٹھی انوشے سے پوچھا تھا۔ جس کے لیے تھپڑ سے زیادہ باپ کے منہ سے نکلے لفظ تکلیف دہ تھے۔ آج اسے سمجھ آئی تھی کہ کئی سال پہلے 'اس کی ماں پہ کیا گزری ہوگی جو اس نے گھر چھوڑنے جیسا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔

"بابا جان! ہمیشہ کی طرح آپ آج بھی اپنی ہی نظر سے دیکھ اور سوچ رہے ہیں! عمر میرا ماموں زاد ہے۔ احسن ماموں کا بیٹا! اور... اور... مما کی آخری خواہش پہ ان کے سامنے میرا اور عمر کا نکاح ہو چکا ہے۔ میں آپ کے مان اور خوف کی وجہ سے ہی اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی تھی! مگر..."

انوشے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جبکہ بابا جان اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ انوشے کی اداسی 'پریشانی کی اصل وجہ یہ تھی اور وہ اسے کچھ اور سمجھ رہے تھے۔

"میں آپ کو بتانا چاہتی تھی۔ بہت بار کوشش کی' مگر میری ہمت 'میرا حوصلہ آپ کے سامنے آتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مجھے اپنی محبت سے جدائی منظور تھی' مما کی آخری خواہش سے منہ موڑنا بھی منظور تھا مگر بابا جان میں آپ کو کھونے کا یا دکھ دینے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آپ نہیں جانتے مگر پچھلے ڈیڑھ سال کا عرصہ میں نے روز مرتے اور جیتے ہوئے گزارا ہے۔ آئی ایم سوری بابا جان! میں سچ میں آپ کی اچھی بیٹی نہیں ہوں۔ جو آپ کا مان نہیں رکھ سکی۔"

انوشے نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا اور بابا جان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ بابا جان کچھ دیر تو اسے دیکھتے رہے پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

پیچھے انوشے بری طرح رو رہی تھی۔ مگر اسے چپ کروانے والا یا دلاسا دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی قسمت کہ ہمدان کے علاوہ 'بابا جان نے بھی اسے وہاں دیکھ لیا تھا۔ وہ عمر کا سائیڈ پوز ہی دیکھ سکے تھے۔ اس سے زیادہ کا حوصلہ نہیں تھا۔ ابھی بھی غصے سے بھرے وہاں سے پلٹ آئے تھے اور انوشے کی واپسی کا انتظار کرنے لگے تھے۔

انوشے نے کمرے میں آکر دروازہ بند کیا اور بیڈ پہ بیٹھ کر نمبر ملانے لگی۔

"ہیلو عمر...!" انوشے نے بھیگی آواز میں پکارا تھا۔ انوشے نہیں چاہتی تھی کہ بابا جان کا غصہ ٹھنڈے ہونے سے پہلے عمر ان سے ملنے آئے۔ ساری بات سننے کے بعد عمر نے اسے تسلی دی تھی اور بابا جان کا غصہ ٹھنڈا ہونے تک انتظار کرنے کو کہا تھا تاکہ وہ سکون سے اس پہلو پہ سوچ سکیں۔

✡ ✡ ✡

انوشے کے آنے سے گھر بھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ماہ رخ نے اتنے مہینوں کے بعد خوشی کا ذائقہ محسوس کیا تھا۔ انوشے کے پاس ہونے سے زندگی خوب صورت لگنے لگی تھی۔ ام کلثوم کی حالت بھی بہتری کی طرف تھی۔ عمر اور انوشے میں بہت اچھی دوستی ہو چکی تھی۔ عمر بھی ماہ رخ کے پیچھے پھوپھو کرتے پھرتا تھا۔ اور انوشے بھی ماں سے لگی رہتی تھی۔

"امی جان کیا سوچ رہی ہیں۔ ڈاکٹر نے آپ کو مکمل طور پر پرسکون رہنے کا کہا ہے۔" احسن نے ماں کے

قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا اور نیم دراز لیٹی ہوئی ام کلثوم کے پاؤں دبانے لگا۔

"نہیں بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ایسے ہی ماہ رخ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کتنی اداس اور چپ چپ سی رہتی تھی اور جس دن سے انوشے آئی ہے۔ ماہ رخ کا چہرہ کھل اٹھا ہے۔ اس کے لبوں کی ہنسی واپس لوٹ آئی ہے۔ مگر کب تک؟ کچھ دنوں بعد انوشے واپس چلی جائے گی۔ پھر ماہ رخ اکیلی رہ جائے گی۔"

ام کلثوم نے اپنے دل کا حال بیٹے کے سامنے عیاں کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہنہوں! امی جان میں نے ماہ رخ سے بہت بار کہا تھا کہ انوشے کی کسٹڈی کے لیے میں وکیل سے بات کرتا ہوں۔ مگر وہ نہیں مانی کہ اس نے اپنی رضا و خوشی سے انوشے کو جہانگیر کو سونپا ہے۔ جتنی اچھی تربیت اور حفاظت جہانگیر کر سکتا ہے اپنی بیٹی کی وہ اکیلے نہیں کر سکتی۔"

احسن نے بہت بار دہرائی اپنی اور ماہ رخ کی بحث سے ماں کو آگاہ کیا تھا۔

"ہاں! میری بھی بات ہوئی تھی اس بارے میں!"

ام کلثوم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"امی میں سوچ رہا ہوں کہ ماہ رخ کی دوسری شادی کر دیتے ہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ میری نظر میں ایک دو رشتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ان سے بات کروں؟"

احسن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو ام کلثوم خاموش نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"میں ماں ہوں میرے دل کی بھی یہ شدید خواہش ہے کہ ماہ رخ کو پھر سے آباد دیکھوں! مگر وہ نہیں مانے گی! میں نے ایک دو بار دبے لفظوں میں یہ بات کرنی چاہی تھی مگر اس کا ردعمل بہت شدید اور سخت تھا۔ اس وقت میں نے خاموشی ہی بھلی سمجھی!"

ام کلثوم نے گہری سانس لے کر کہا۔ یہ سب باتیں ہی تو انہیں اندر سے بہت کمزور کرتی جا رہی تھیں۔

کچھ دیر کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے رہے۔ پھر اس خاموشی کو ام کلثوم کی نحیف آواز نے توڑا۔

"احسن! میرے بعد تم اس گھر کے بڑے ہو! میرے بیٹے وعدہ کرو مجھ سے کہ تم ہر ذمہ داری کو اچھے طریقے سے نبھاؤ گے۔ سب کو جوڑ کر رکھو گے اور خاص کر۔۔۔ میری ماہ رخ کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑو گے! اللہ کے بعد میں اسے تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ میری بچی بہت سادہ اور معصوم ہے۔ اسے دنیا کی بھیڑ میں کھونے مت دینا تم نہیں جانتے اس کی فکر مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔"

ام کلثوم نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ان کا سانس پھولنے لگا تھا۔ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے۔ احسن گھبرا کر اٹھا اور فوراً" انہیں پانی پلایا اور ان کا ہاتھ تھام کر تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"امی جان! میں وعدہ کرتا ہوں۔ ماہ رخ کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ آپ بس ریلیکس رہیں۔ زیادہ مت سوچیں اللہ مالک ہے سب کا۔"

احسن نے کہا تو ام کلثوم سکون بھرا سانس لیتی ہوئی مسکرا دی تھیں۔ اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد ام کلثوم فجر کی نماز پڑھ کر تسبیح پڑھتے ہوئے۔ دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئی تھیں۔

احسن جس کی دو دن بعد کی فلائٹ تھی واپس کینیڈا جانے کی۔ اسے کینسل کروانی پڑی۔ جنید کے آنے کی وجہ سے میت کو ایک رات کے لیے سرد خانے میں رکھا گیا تھا۔ اور جنید کے آتے ہی نماز جنازہ کے بعد تدفین کر دی گئی تھی۔ مریم کو ڈاکٹرز نے سفر کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس لیے وہ نہیں آ سکی تھی۔ جنید بھی تین دن بعد' ہزار وعدے کیے اور ماہ رخ کو تسلی دے کر واپس چلا گیا تھا۔

ماہ رخ صدمے سے نڈھال تھی۔ انوشے کو جہانگیر ابھی لینے نہیں آیا تھا۔ ام کلثوم کے انتقال کی خبر اس تک بھی پہنچ گئی تھی۔ شاید اس لیے اس نے انوشے کو مزید کچھ دن ماہ رخ کے ساتھ رہنے دیا تھا۔ گھر مہمانوں

سے بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا اور بھاگ بھاگ کر کام کرتی' سب کو پوچھتی' زارا کا پیر سلپ ہو گیا۔ اسے فوراً" اسپتال لے جایا گیا۔ خوش قسمتی سے بچہ محفوظ رہا' مگر ڈاکٹرز نے سختی سے بیڈ ریسٹ کرنے کی ہدایت کی اور سفر کرنے سے منع کر دیا۔ یوں مجبوراً" ڈلیوری تک' زارا کو پاکستان میں ہی قیام کرنا تھا۔ احسن کو اس میں اللہ کی بہتری لگی۔ یوں بھی ماہ رخ کو فی الحال اکیلا چھوڑنا یا ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ احسن کو یہ کچھ مہینے غنیمت لگے اور وہ ماہ رخ کے ویزے کے لیے کوشش تیز کر دی۔

غم سے نڈھال ماہ رخ کے لیے ماں کی جدائی کا صدمہ بہت بڑا اور اگر ایسے میں انوشے نہ ہوتی تو شاید وہ غم سے اپنے حواس کھو بیٹھتی۔

اسکول میں پہلے ہی انوشے کی بہت چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ اسی لیے مجبوراً" اسے واپس جانا پڑا' مگر ہر ویک اینڈ پہ جہانگیر باقاعدگی سے اسے بھیج دیتا تھا۔ ماہ رخ کبھی کبھی بہت حیران ہوتی تھی کہ بغیر کچھ کہے' سنے وہ انوشے کو ماہ رخ کے پاس بھیجنے لگا تھا۔ ان دنوں ہی گرمیوں کی چھٹیاں آگئیں اور جہانگیر' انوشے کو ماہ رخ کے پاس چھوڑ کر کام کے سلسلے میں دبئی چلا گیا تھا۔

زارا کی ڈلیوری میں بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا تھا۔ احسن کی آمد بھی کچھ دنوں تک متوقع تھی۔ عمر اور انوشے میں وقت کے ساتھ ساتھ دوستی پروان چڑھتی جارہی تھی۔ دونوں کا وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا تھا۔ ان ہی دوڑتے بھاگتے دنوں میں خوشی کے لمحات آئے اور آکر ٹھہر گئے۔ ننھے شہرام کی آمد نے غم زدہ فضا میں خوب صورت قلقاریاں گونجنے لگی تھی۔ احسن بھی پاکستان آچکا تھا۔ ماہ رخ کا ویزا بھی لگ گیا تھا۔ اب بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی' ماہ رخ کے کینیڈا شفٹ ہونے میں۔ مگر ماہ رخ' انوشے کی وجہ سے پاکستان چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ دوسری طرف احسن بھی اپنی بات اور وعدے پہ قائم تھا کہ ماہ رخ کو اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

مگر فی الحال تو سب مسئلے مسائل کو بھلا کر سب شہرام میں مگن تھے۔ شہرام کا عقیقہ بھی ساتویں دن کر دیا گیا۔ اس موقع پہ سب نے ہی ام کلثوم کی کمی کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ شہرام کی پیدائش کے ایک مہینے بعد جنید اور مریم کے یہاں دو جڑواں بیٹیوں کی پیدائش ہوئی۔ دونوں بچیاں ہی بہت خوب صورت اور صحت مند تھیں۔ جنید نے ان کی تصویریں بھیجی تھیں۔ سب ہی بہت خوش تھے۔ جلد ہی احسن اور زارا کی واپسی ممکن تھی۔ احسن' ماہ رخ سے دوٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔

"ماہ رخ! کیا سوچ رہی ہو؟" احسن نے برآمدے کی سیڑھیوں پہ ماہ رخ کو بیٹھے دیکھا تو اس کے پاس ہی بیٹھتا ہوا دھیرے سے اس کا سر ہلا کر پوچھا۔ ماہ رخ گرمیوں کی ڈھلتی شام میں عمر اور انوشے کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھ رہی تھی۔ چونک گئی اور گردن موڑ کر بھائی کا چہرہ دیکھا۔ جو اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس ایسے ہی انوشے پرسوں واپس چلی جائے گی اور پھر آپ سب بھی۔۔۔ یہ گھر کتنا خالی ہو جائے گا۔" ماہ رخ نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"میں نے سوچ لیا ہے کہ جانے سے پہلے گھر کو رینٹ پہ دے دوں گا۔ میرا بچپن کا دوست ہے آذر' وہ سب کچھ دیکھ لے گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

احسن نے اس طرح بات کرتے ہوئے کہا جیسے ماہ رخ اور وہ کافی دیر سے گھر کے معاملے پہ ہی بات کر رہے ہوں۔ ماہ رخ نے الجھن بھرے انداز میں احسن کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ احسن نے اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کیا اور گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"دیکھو ماہ رخ! میں نے امی جان سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارے پاس دو راستے ہیں یا تو میرے ساتھ کینیڈا چلو یا پھر۔۔۔" احسن نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ماہ رخ کے سوالیہ چہرے

کی طرف دیکھا تھا۔

"یا پھر تم دوسری شادی کے لیے مان جاؤ۔" احسن نے بات مکمل کی تو ماہ رخ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں میں دوسری شادی نہیں کر سکتی۔" ماہ رخ نے بے بسی سے کہا تھا۔ "پھر ٹھیک ہے' تم ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔ میرا وعدہ ہے تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی میری طرف سے۔"

احسن نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا اور ماہ رخ کا جھکا ہوا سر تھپکتا ہوا اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اور یوں ماہ رخ روتی آنکھوں اور دکھی دل کے ساتھ پاکستان کو چھوڑ کر کینیڈا جا بسی۔

انوشے سے اس کا رابطہ فون پہ رہنے لگا۔ پھر نیٹ اور موبائل نے مزید سہولت مہیا کر دی۔ ماہ رخ سال میں ایک بار پاکستان ضرور آتی تھی۔ اپنے آبائی گھر میں۔۔۔ اور تب انوشے بھی ماں سے ملنے ان کے پاس آجاتی تھی۔ اکثر ماہ رخ اکیلی ہی پاکستان آتی تھی۔ مگر احسن اور عمر بھی ان کے ساتھ بہت بار آئے تھے۔ انوشے کالج کے پہلے سال میں آئی تو ماہ رخ نے اسے چھٹیوں میں اپنے پاس کینیڈا بلا لیا۔

انوشے کے پیپرز پہلے سے ہی تیار تھے۔ ویزا بھی لگ چکا تھا۔ ماہ رخ اور انوشے کو یہ ڈر تھا کہ جہانگیر منع نہ کر دے۔ مگر انوشے کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب بابا جان نے تھوڑے تامل کے بعد اسے کینیڈا جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ان دنوں احسن پاکستان آیا ہوا تھا۔ تب انوشے ان کے ساتھ پہلی بار کینیڈا گئی تھی۔ پھر ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ایسا ہی ہونے لگا تھا اور جب انوشے ڈیڑھ سال پہلے آخری بار کینیڈا گئی تو ایک جان لیوا انکشاف اس کا منتظر تھا۔ جس نے اس کے وجود کی دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس سے وہ فیصلہ ہو گیا جس کا تصور اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

انوشے کو کتنی دیر ہو گئی تھی ابنِ سرد رات میں لان میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہوئے۔ مغرب کے وقت ہمدان کو گھر میں آتا دیکھ کر' امید کی ایک نئی کرن چمکی تھی۔ مگر ہمدان اسے نظر انداز کرتا ہوا بابا جان کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ بابا جان کل شام سے کمرہ بند کیے بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانا بھی اپنے کمرے میں منگوا رہے تھے۔ آج صبح آفس بھی نہیں گئے تھے۔ انوشے نے بہت بار ان کے کمرے کے دروازے تک جا کر واپس پلٹ آئی تھی۔

مختلف سوچوں میں گھرے وہ خاموشی سے اندر چلی آئی اور اپنی نگرانی میں چائے کی ٹرالی سیٹ کر کے اندر بھجوا دی۔

ہمدان کے ساتھ نہ جانے کون سی باتیں تھیں جو ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ انوشے جلے پیر کی بلی کی طرح اندر سے باہر پھر رہی تھی۔ جب اس نے ہمدان کو بابا جان کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا' اس سے پہلے کہ انوشے اسے پکارتی وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا جانے لگا۔ انوشے بھی اس کے پیچھے لپکی تھی۔

"ہمدان! میری بات سنو پلیز۔" انوشے نے تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔ انوشے کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ہمدان اسے سامنے دیکھ کر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟" انوشے نے روہانسی لہجے میں پوچھا تھا۔

"تم! جو چاہو کرو وہ جائز ہے؟ تم جسے چاہے' جیسے چاہو استعمال کرو' وہ سب جائز ہے؟ تم اپنوں کو آسانی سے بے وقوف بنالو' وہ سب جائز ہے اور تم۔۔۔"

انوشے بابا جان کو تم پہ بہت یقین اور اعتماد تھا اور اسی یقین اور اعتماد کے تحت بابا جان نے کبھی تم پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ حتیٰ کہ اکیلے کینیڈا آنے اور جانے پر بھی۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟ بابا جان کے ساتھ ساتھ تم نے ہم سب کو بھی شدید دھچکا پہنچایا ہے۔ شادی ہونا یا نہ ہونا ایک الگ بات تھی مگر ہم دوست پہلے تھے کیا تمہیں نہیں لگتا تم نے یہ سب چھپا کر اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے ساتھ بھی زیادتی

کی ہے۔" ہمدان نے اپنے سامنے بیٹھی گم صم سی انوشے کو دیکھا تھا۔ جس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

"ہمدان تم جانتے ہو زندگی میں سب سے آسان کام کیا ہے؟" اس نے بھیگی آواز میں پوچھا تھا مگر جواب کا انتظار کیے بغیر گویا ہوئی۔

"دوسروں پہ تنقید کرنا انہیں یہ بتانا کہ تم نے آج تک جو کیا غلط کیا' مگر کبھی خود کو اس کی جگہ رکھ کر یہ نہیں سوچتے ہم لوگ کہ اگر کسی نے ایسا کچھ کیا تو کیوں کیا؟" انوشے کے کہنے پہ ہمدان نے "ونہہ" کہہ کر سر جھٹکا تھا۔ جیسے وہ انوشے کی بات سے متفق ہو۔

"میں پانچ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی جب میرے ماں' باپ میں علیحدگی ہوگئی۔ میرے ضدی اور انا پرست باپ نے میری ماں کو قصور نہ ہوتے ہوئے بھی طلاق دے دی اور کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ ایک بچہ جو اپنی ماں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا ہو اور ایک دن اچانک صبح اٹھتے ہی اسے پتا چلے کہ اس کی ماں اس کے پاس نہیں ہے۔ خاموں کے ہجوم میں ہر چہرے میں اپنی ماں کو ڈھونڈتی اس بچی کی اذیت جان سکتے ہو تم؟ آپ کے اردگرد ہزاروں چہرے ہوں صرف ایک اس چہرے کو چھوڑ کر جس سے آپ کی زندگی بندھی ہو اور ایک دن اس بچی کے بہت رونے اور بلکنے پہ اس کے باپ نے سختی سے ڈانٹا تھا کہ وہ بچی سہم گئی اور دوبارہ کبھی سرعام رونے یا ضد کرنے کے بجائے راتوں کو کمبل یا تکیے میں سر دے کر رو لیتی تھی۔ ڈر تو اسے شروع سے ہی اپنے سخت گیر باپ سے لگتا تھا اور اس دن کے بعد سے اس بچی کے لبوں پہ قفل مگر ننھے سے ذہن میں لاکھوں سوالات تھے۔ جن کے جوابات رحیمہ بی بی بھی نہیں دے سکتی تھیں سوائے اس کے کہ۔۔۔۔

"اب تمہاری ماں کبھی اس گھر میں دوبارہ نہیں آسکتی ہیں۔" انوشے کے لہجے میں بچپن کی محرومی اور اذیت بہت نمایاں تھی۔ ہمدان نے دکھ بھری نظروں سے' اس بکھری بکھری سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ جس نے آج تک کبھی اپنی کسی محرومی پہ بات نہیں کی تھی اور آج۔۔۔۔

"ان ہی دوڑتے بھاگتے دنوں میں' میرا اسکول میں داخلہ ہوگیا۔ اسکول کا پہلا دن تھا اور رحیمہ بی بی میرے ساتھ گئی تھیں۔ بابا جان بہت مصروف تھے اور ویسے بھی ان کے نزدیک ایسی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان کے نزدیک اولاد سے محبت یہ ہی تھی کہ اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا جائے۔

اسکول میں بچوں کو ان کی ماؤں کے ساتھ دیکھ کر' اس لمحے اس پانچ سال کی بچی کو اپنی بدقسمتی پہ بہت رونا آیا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں خشک تھیں' مگر اس کے اندر بہتے آنسو آج بھی اس لمحے کی بدنصیبی پہ گرتے ہیں۔ کبھی خشک نہیں ہوتے اور اس کے بعد بھی ایسے کتنے لمحے اور لاتعداد پل ہیں جب اس بچی نے ماں کی کمی' اس کے لمس کو محسوس نہیں کیا تھا۔ بابا جان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ دیکھتے ان کی انوشے کس تنہائی اور کرب سے گزر رہی ہے۔" انوشے نے ماضی کی سڑکوں پہ چلتے ہوئے کہا تھا۔

"پھر نہ جانے وقت کو کیسے رحم آگیا اور ایک دن رحیمہ بی بی نے میرا بیگ پیک کرتے ہوئے بتایا کہ وہ مجھے میری ماں سے ملوانے لے جارہی ہیں۔ کتنے ہی لمحے مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا۔ سارا راستہ خوشی اور حیرانی میں کٹا تھا اور جب دس مہینوں کے بعد میں نے اپنی ماں کو دیکھا تو میرے کب کے رکے آنسو آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ میری ماں مجھے بے تحاشا چوم رہی تھیں۔ کبھی میرے چہرے کو' کبھی میرے ہاتھوں کو اور میں روتے روتے بھی بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ وہاں سب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ نانو کے گھر میں جو محبت اور اپنائیت اور گرم جوشی کی فضا تھی۔ اسے میں آج تک بھی نہیں بھولی ہوں۔ پھر میری دوستی احسن ماموں کے بڑے بیٹے عمر سے ہوگئی۔ جو مجھ سے ایک سال ہی بڑا تھا' مگر میرا خیال اس طرح رکھتا تھا۔ جیسے میں ننھی بچی ہوں اور وہ مجھ سے کئی سال بڑا ہے۔ دن بہت خوشی اور اطمینان سے گزر رہے تھے۔ مما' نانو کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھیں' مگر میرے آنے سے ان کے چہرے پہ

رونق آگئی تھی۔ مما جب بھی فارغ ہوتیں ہم ڈھیروں
باتیں کرتے۔ مما مجھے بہت کچھ سمجھاتی تھیں اور ان
کی ہر بات کا لب ولباب یہ ہی ہوتا تھا کہ۔۔۔"

"تمہیں اچھی بیٹی بن کر اپنے بابا جان کا کہنا ماننا ہے
ان کا خیال رکھنا ہے۔۔۔ اور میں سمجھ داری سے سرہلا
دیتی اور مما کی کہی ہر بات کو گرہ سے باندھ لیتی تھی۔ ان
ہی دنوں نانو کا انتقال ہو گیا۔ مما کی قسمت عجیب تھی'
ایک خوشی ملتی تھی اور ساتھ ہی ایک غم تیار رہتا تھا۔
مما کے لیے صدمہ بہت بڑا تھا۔ بابا جان نے نانو کے
انتقال کا سن کر مجھے مما کے پاس مزید کچھ دن اور رہنے
دیا۔ مگر کب تک آخر ایک دن مجھے واپس آنا ہی تھا اور
پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔ تب قسمت نے پھر پلٹا کھایا اور
مما کو مجبوراً" احسن ماموں کے ساتھ کینیڈا جانا پڑا۔ ہر
ویک اینڈ پہ ملنے والا سلسلہ ختم ہو گیا تھا مگر مما ہر سال
میری گرمیوں کی چھٹیوں میں پاکستان ضرور آتی تھیں
اور وہ تین مہینے میں اور مما ساتھ گزارتے تھے۔ کبھی
مما اکیلی آتی تھیں۔ کبھی احسن ماموں ساتھ ہوتے
تھے۔ پھر جب میں کالج میں آئی تو مما نے مجھے کینیڈا
بلایا پہلی بار' مجھے بہت ڈر تھا کہ بابا جان منع کر دیں گے'
مگر حیرت انگیز طور پر انہوں نے مجھے جانے کی اجازت
دے دی تھی اور یوں میں پہلی بار احسن ماموں کے
ساتھ کینیڈا گئی اور پہلی بار ہی میں نے جانا کہ گھر کسے
کہتے ہیں؟؟"

انوشے کی نظریں دور کہیں بھٹک رہی تھیں جیسے وہ
اپنے گزرے کل کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہو۔ اس کے
ہونٹوں پہ مدھم سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ ہمدان بہت
غور و توجہ سے اس ان کہی داستان جیسی لڑکی کو سن رہا
تھا جو اتنا عرصہ خاموش رہی تھی اور آج جب بولی تو
رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"احسن ماموں کینیڈا میں ویل سیٹلڈ تھے۔ ان کا وہ
خوب صورت گھر اور اس گھر کی محبت بھری فضا میں
سانس لینا مجھے بہت انوکھا اور اچھا لگ رہا تھا۔ احسن
ماموں اور زارا ممانی کی نوک جھونک' وارفتگی ایک
دوسرے کا خیال رکھنا' ایک دوسرے کو عزت و محبت
سے دیکھنا اور پکارنا' بار بار میری توجہ کھینچتا تھا۔ عمر سے
میں کافی عرصے کے بعد ملی تھی۔ اس میں بہت تبدیلی
آچکی تھی۔ میری جھجک بہت واضح تھی۔ مگر عمر کا رویہ
میرے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے ہم آج بھی بچپن کی سرحد
پہ کھڑے ہیں اور اس کے اسی دوستانہ رویے کی وجہ
سے ہم پھر سے جلد گھل مل گئے۔ شہرام کی معصوم اور
بچکانہ حرکتیں سارے گھر میں قہقہے بکھیر دیتی تھی۔
شہرام مجھے پری جی کہتا تھا۔ ان سب کے لیے میں پری
ہی تھی۔ مما وہاں بہت خوش تھیں۔ میں جتنا وقت
وہاں گزارتی تھی' وہ اس انوشے سے مختلف ہوتا تھا جو
یہاں ہوتی تھی۔

مما۔۔۔ میں عمر' شہرام کبھی کبھی احسن ماموں اور
ممانی بھی ہم مل کر مختلف گیمز کھیلتے' گھومنے پھرنے
جاتے' کچھ اور نہیں تو ویسے ہی سڑکوں پہ واک کرنے
نکل جاتے۔ مل کر موویز دیکھتے کتنے ہی خوب صورت
اور یادگار پل میں اپنی مٹھی میں جگنو کی طرح قید کر کے
لے آتی تھی اور یہاں کے جامد سناٹے اور تنہائی میں
ان لمحوں کے جگنو۔۔۔۔ ہر طرف چمک کر روشنی
کر دیتے تھے۔ بابا جان اکثر جب کبھی فارغ ہوتے تو ہم
آتش دان کے پاس بیٹھ کر بہت سی باتیں کرتے تھے۔
اس گھر کے جامد سناٹے اور تنہائی سے گھبرا کر میں ہر
وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ گھر میں شور ڈالے
رکھتی تھی۔ کچھ اور نہیں تو علشبہ کو اکثر اپنے پاس بلا
لیتی۔ دونوں پھوپھو میں سے کوئی نہ کوئی رہنے آجاتا۔
تم آجاتے تھے۔ سب کچھ ٹھیک جارہا تھا' مگر زندگی میں
ایک ایسا موڑ آیا کہ سب کچھ بدل کر رہ گیا۔"

انوشے نے تھک کر گہری سانس لی تھی اور ہمدان کو
ساتھ لیے ماضی کے اس وقت میں پہنچ گئی جس نے
زندگی کا مفہوم ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عمر! مما نہیں آئیں مجھے لینے۔" انوشے نے ایر
پورٹ سے باہر نکلتے ہی فوراً" عمر سے سوال کیا تھا جو
اس کا سامان گاڑی میں رکھ رہا تھا۔ شدید برف باری

ہو رہی تھی۔ انوشے کو روئی کے گالوں سی گرتی برف بہت پسند تھی۔ ابھی بھی سردی سی کانپتی 'وہ کار کا دروازہ کھول کر جلدی سے بیٹھ گئی تھی۔ اتنے سالوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ مما اسے لینے ایرپورٹ نہ آئی ہوں۔ اسی لیے انوشے نے عمر سے پہلا سوال مما کی غیر حاضری کا کیا تھا۔

"ابھی گھر جا ہی رہی ہو نا مل لینا پھوپھو سے۔" عمر نے سرسری سا کہا۔ انوشے کو وہ کچھ پریشان اور اداس لگا تھا۔ سارا راستہ عمر نے ادھر ادھر کی معمولی باتیں کرتا رہا۔ جیسے اپنا ذہن بٹانا چاہ رہا ہو۔

"گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ سب کہاں گئے ہوئے ہیں۔"

انوشے گھر پہنچتے ہی فورا" بھاگ کر اندر گئی تھی۔ مگر گھر کا مین ڈور لاک تھا۔ جسے عمر نے آگے بڑھ کر کھولا تھا اور اس کا بیگ اٹھا کر اندر لایا۔ انوشے نے الجھن بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ جو لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھا کار کی چابی ہاتھ میں تھماتا کسی گہری سوچ میں تھا۔

انوشے کا دل کسی انہونی کے احساس سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ عمر کے پاس ہی صوفے پہ ٹکتے ہوئے دھیرے سے پوچھنے لگی۔

"عمر! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" انوشے نے کسی خدشے کے تحت پوچھا تھا۔ تو عمر گہری سانس لیتا ہوا اپنے خیالوں سے باہر آیا۔ اور انوشے کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کے چہرے پہ وہی ڈر اور خوف تھا جو بچپن میں ماں سے جدا ہوتے وقت ہوتا تھا۔ یہ ڈر' یہ خوف دور کرنے ہی تو وہ اس کے دوستوں میں شامل ہوا تھا۔ اور شاید دوستی کے رشتے سے بھی کچھ زیادہ! مگر کیا...؟ ابھی یہ واضح نہیں تھا۔

"انوشے تمہیں میری بات کو بہت صبر اور تحمل سے سننا ہو گا۔"

عمر نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔ تو انوشے حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ عمر نے ہمیشہ اسے "پری" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یہاں پہ سب اسے پری ہی کہتے تھے اور آج جب عمر نے اس کا نام لیا تو انوشے کو بہت عجیب لگا تھا۔

"کیا ہوا عمر؟ سب ٹھیک تو ہے میرا دل بہت گھبرا رہا ہے جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے! مما کہاں ہیں اور گھر کے باقی لوگ۔"

انوشے نے بے تابی سے سوال کیا تو عمر اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"انوشے! پھوپھو اسپتال میں ایڈمٹ ہیں!" عمر نے آہستگی سے کہا تو انوشے خوفزدہ سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا مما کو! بتاؤ عمر میرا دل بند ہو جائے گا۔" انوشے نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا مگر اس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اور ہاتھوں میں واضح لرزش تھی عمر نے دھیرے سے اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر جیسے حوصلہ دینا چاہا۔

"انوشے! دراصل پھوپھو کو بلڈ کینسر ہے۔ اور آخری اسٹیج پر ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ اسی وجہ سے تم سے بات نہیں کر رہی تھیں یا تمہارے سامنے آنے سے گریز کر رہی تھیں کیونکہ وہ اس موذی مرض سے لڑ رہی تھیں اور..."

عمر نے اتنا ہی کہا تھا کہ انوشے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ عمر لب بھینچے اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"مما اتنی اذیت' اتنی تکلیف میں تھیں اور مجھے کسی نے بتانا ضروری ہی نہیں سمجھا۔"

انوشے غم و غصے سے پھٹ پڑی تھی۔ پھوپھو کو جب پتا چلا کینسر اپنی آخری اسٹیج پہ تھا۔ ڈاکٹرز زیادہ پر امید نہیں تھے۔ پھوپھو تمہیں اس لیے نہیں بتانا چاہتی تھیں کیونکہ تمہارا فائنل ایر تھا۔ اگر تمہیں پتا چلتا تو تم سب کچھ چھوڑ کر چلی آتیں۔ وہ تمہارے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہیں خود آنے کو کہتی تم نے پہلے ہی اپنے آنے کے بارے میں بتا دیا تھا۔"

عمر نے آہستہ آہستہ کر کے اسے تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

"میں غیر نہیں ہوں ان کی بیٹی ہوں اور میرے لیے میری ماں کی زندگی اور محبت سے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس مشکل وقت میں انہیں میری ضرورت تھی۔ مگر کسی نے مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔"

انوشے نے روتے ہوئے اپنا سر عمر کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔ کیسا عجیب رشتہ تھا کہ جس سے شکوہ کر رہی تھی۔ آنسوؤں بہانے کے لیے سہارا بھی اسی کندھے کا لیا ہوا تھا۔ عمر نے خود کو ان آنسوؤں میں بہتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

"پھوپھو کی حالت پچھلے ایک ہفتے سے بہت خراب ہے۔ وہ دوائیوں کے زیر اثر مسلسل بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ سب گھر والے بھی وہاں ہی ہیں میں تمہیں فوراً" وہاں لے جا کر کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ پھوپھو کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنا۔ ان کے سامنے ایسا کرو گی تو انہیں بہت تکلیف پہنچے گی۔"

عمر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تو انوشے اس سے الگ ہوتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں!" انوشے نے اپنا بھیگا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے منہ پھیرنے سے عمر سمجھ گیا تھا کہ وہ ابھی بھی ناراض ہے۔ عمر گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسپتال تک کا راستہ بہت خاموشی سے کٹا تھا۔ مگر عمر جانتا تھا کہ وہ سارا راستہ روتی ہوئی آئی ہے۔ انوشے اسپتال پہنچی تو وہاں اس نے احسن ماموں، ممانی جان اور شہرام کو بھی موجود پایا تھا۔ انوشے حسن ماموں کے گلے لگ کر سسک پڑی ان کی آنکھیں بھی ضبط سے سرخ ہونے لگی تھیں، اپنے سینے سے لگائے، اس کا سر تھپکتے وہ خاموش کھڑے تھے۔ اسی وقت زارا ممانی نے آگے بڑھ کر اسے ان سے الگ کیا۔ ماموں، عمر کو لیے باہر چلے گئے۔ ان کے لیے مزید یہ رکنا مشکل ہو رہا تھا۔

"صبر کرو پری بیٹا! اللہ کی مرضی اسی میں تھی ہم انسان مجبور ہے اس کے حکم کے آگے!"

زارا ممانی نے ویٹنگ روم میں بیٹھے اسے خود سے لگائے تسلی دی تھی۔

"میں مما کو دیکھ سکتی ہوں؟" انوشے نے آنسو پونچھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ تو زارا ممانی سہلاتی اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ انوشے نے اسپتال کے بستر پہ لیٹے وجود کو دیکھا تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ منہ پہ ہاتھ رکھے۔ اپنی چیخوں کو روکنے لگی تھی۔ سامنے لیٹا ڈھانچہ، اس کی ماں کیسے ہو سکتی تھی! اس کی ماں تو زندگی کے سب خوب صورت رنگوں سے بنی، حسین تصویر تھیں۔ ماہ رخ کی خوب صورتی، ڈھلتی عمر میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ اور سامنے مشینوں کے سہارے سانس لیتا وجود تو اس کی ماں کا سایہ بھی نہیں لگ رہا تھا۔ انوشے چپ چاپ کھڑی ان کے قدموں کے پاس روتی رہی۔ پھر آگے بڑھی اور ان کا نحیف ہاتھ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی ماہ رخ نے اس کے لمس کو محسوس کر لیا تھا۔ جن سے دل کے رشتے جڑے ہوں وہ عالم بے ہوشی میں بھی اسی طرح محسوس ہوتے ہیں جیسے ہوش و خرد میں!

"انوشے، میری جان! میری پری!" ماہ رخ کے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی تھی۔ انوشے نے چونک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ زارا ممانی اسے وہاں چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ عمر کب اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ انوشے بے تابانہ ماں کی طرف لپکتی، عمر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا تھا۔ انوشے ایک دم سنبھلی۔ اس وقت تک ماہ رخ آنکھیں کھول چکی تھی۔

"انوشے!" ماہ رخ کی مردہ ہوتی آنکھوں میں زندگی لہرائی تھی اسے سامنے کھڑا دیکھ کر۔

"مما! میں اب آگئی ہوں نا دیکھنا آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں گی۔" انوشے نے مضبوط بنتے ہوئے آگے ہو کر ماں کا ماتھا چوما تھا۔

"شکر ہے ان آنکھوں کی جوت بجھنے سے پہلے تمہیں دیکھ لیا میں نے! محسوس کر لیا! تمہارے لمس کو اپنے اندر جذب کر لیا۔"

ماہ رخ نے نحیف آواز میں بمشکل جملہ مکمل کیا تھا۔ ماں کی بات سن کر انوشے کا ضبط ٹوٹ سا گیا وہ بے ساختہ رو پڑی۔

"انوشے۔" ماہ رخ نے اسے روتے دیکھا تو بے ساختہ تڑپ اٹھیں۔ اور اٹھنے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ انوشے کو روتے دیکھنا' ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ اسی وقت پاس کھڑا عمر آگے بڑھا اور انوشے کو چپ کروانے لگا۔ ماہ رخ ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ بظاہر بہت عام سا منظر تھا مگر اس میں کچھ خاص ضرور تھا! اس عام سے منظر کو دیکھتی' ان کی سوچ ایک خاص رنگ بھرنے لگی! کتنی خواہش اور چاہ ہوتی تھی ان کی کہ جہانگیر بھی کبھی اسی محبت اور چاہت سے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھتا۔ عمر کے چہرے پہ اذیت کی واضح لکیر تھی جو انوشے کو اس طرح سے روتے دیکھ کر اس کے چہرے پہ ابھری تھی۔ انوشے نے اپنا سر عمر کے کندھے سے لگا دیا تھا۔ ماہ رخ کی بنجر ہوتی سماعتوں سے جانفزا جیسا فقرہ ٹکرایا تھا۔

"انوشے پلیز سنبھالو خود کو! تمہارے آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔"

اگر ایک مرد کسی عورت سے کہے کہ "تمہاری آنکھ سے بہتے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں!" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد' اس عورت کو دل کی سچائیوں سے چاہتا اور عزت دیتا ہے اور زندگی میں دانستہ طور پر تو کبھی بھی اسے دکھ یا تکلیف پہنچانے کا' سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر زندگی میں ساتھ چلنے والا اہم سفر اتنا مہربان مل جائے تو زندگی اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ بھی خوب صورت اور مہربان لگتی ہے۔

ماہ رخ کے کمزور چہرے پہ نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی انوشے کی آئندہ زندگی کو لے کر جو اندیشے اور خوف اسے ستاتے رہتے تھے وہ آج ایک دم ختم ہی ہو گئے تھے۔

ماہ رخ نے اشارے سے عمر کو پاس بلایا۔ عمر "جی پھوپھو" کہتا ہوا ماہ رخ پہ جھک کر بات سننے لگا اور ان کی بات سن کر سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ کچھ دیر میں اس کی واپسی اپنے باپ کے ساتھ ہوئی۔ ماہ رخ نے انہیں ہی بلانے کو کہا تھا' دونوں بہن بھائی کو اکیلا چھوڑ کر عمر اور انوشے باہر نکل گئے۔ احسن ماموں کے بلانے پہ زارا ممانی بھی اندر چلی گئیں۔ کچھ دیر کے بعد دونوں باہر آئے تو ان کے چہرے خوشی اور جوش سے تمتما رہے تھے احسن ماموں نے پیار سے انوشے کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا اور زارا ممانی نے اس کی پیشانی چوم کر گلے سے لگا لیا تھا۔ انوشے نے نا سمجھی سے ان کی طرف دیکھا تھا مگر احسن ماموں نے اسے اور عمر کو ماہ رخ کے پاس جانے کا کہا' انوشے الجھتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ ماہ رخ کے چہرے پہ اطمینان اور خوشی واضح دیکھی اور محسوس کی جا سکتی تھی۔

ان کے ایک طرف انوشے اور دوسری طرف عمر کھڑا ہو گیا تھا۔ ماہ رخ نے انوشے کا نازک ہاتھ اپنے کمزور ہاتھ میں لے کر دبایا اور دوسرے ہاتھ سے عمر کا مضبوط ہاتھ پکڑ کر انوشے کا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ دونوں نے چونک کر پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر طمانیت سے مسکراتی ماہ رخ کے طرف جس نے انوشے کی حیران نظروں میں دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا تھا جبکہ عمر کو اس لمحے ایسا لگا تھا جیسے یک دم ہی وہ مالا مال ہو گیا تھا۔ اسے دنیا کا سب سے قیمتی اور نایاب خزانہ مل گیا تھا۔ اس لمحے عمر کو احساس ہوا کہ اس کے لیے انوشے کیا تھی؟ اور اس کا مل جانا' س کی زندگی جیسا تھا۔

"مما!" انوشے کے لب حیرت کی شدت سے ہلے تھے۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں حیرانی ٹھہر گئی تھی' مگر جب اس نے ماہ رخ کی مردہ ہوتی آنکھوں میں زندگی کی امید کی روشنی دیکھی تو دنگ رہ گئی۔ امید کے خواب کے یہ روشن جگنو نے ماہ رخ کی آنکھوں سے سفر کیا اور انوشے کی آنکھوں سے ہوتے دل کے شہر میں جگمگانے لگے۔ انوشے نے ایک نظر سامنے کھڑے عمر

یہ ڈالی جو بہت وارفتگی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ عمر کی نظروں کے بدلتے انداز سے گھبرا کر انوشے نے نظریں جھکالی تھیں۔ اسی شام قریبی مسجد میں ان کا نکاح ہو گیا تھا۔ ماہ رخ کی حالت میں یک دم ہی بہت تبدیلی آگئی تھی۔ اس کے کمزور اور زرد چہرے پر زندگی کی امید نظر آنے لگی تھی۔ مگر انوشے بہت چپ چپ اور پریشان نظر آتی تھی۔

"انوشے! میری جان! کیا تم میرے فیصلے سے خوش نہیں ہو؟" ماہ رخ نے اپنے بیڈ کے پاس کھڑی انوشے کا ہاتھ اپنے کمزور ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں مما! ایسی بات نہیں ہے مگر۔" انوشے نے ماں کو تسلی دی تھی۔

"تین دن ہو گئے ہیں تمہارے نکاح کو ہوئے اور ان تین دنوں میں تم مجھے خوش نظر نہیں آئیں۔" ماہ رخ نے استفسار کیا۔

"مما! مجھے آپ کی پسند پہ پورا یقین اور اعتبار ہے' مگر مما! جب بابا جان کو پتا چلے گا تو؟" انوشے نے دل میں پنپتے خوف کو زبان دیتے ہوئے کہا۔ تو ماہ رخ اس کا ہاتھ تھپتھپا کر بولی تھیں۔

"ہوں! میں سمجھتی ہوں' مگر تم پریشان مت ہو میں بات کروں گی تمہارے بابا جان سے اور تمہاری رخصتی پوری شان و شوکت سے' ان کی دعاؤں کے سائے میں ہی ہوگی۔"

ماہ رخ نے بیٹی کو دلاسا دیا تھا۔ وقتی طور پر ہی سہی انوشے بہل گئی تھی اور اس بات کے' ٹھیک دو دن بعد ماہ رخ کا انتقال ہو گیا تھا۔ انوشے نے روتے ہوئے بابا جان کو فون پر اطلاع دی تھی۔ انوشے کے لیے یہ بہت دکھ اور بہت بڑا صدمہ تھا جس سے سنبھلنے اور نکالنے میں احسن ماموں سمیت ان کے گھر کے ہر فرد نے بہت ساتھ دیا تھا اور یہاں سے ہی اس نے عمر کی محبت' وارفتگی' فکر مندی کے نئے انداز دیکھے تھے اور جب دو مہینے کے بعد انوشے کینیڈا سے لوٹی تو یکسر بدل چکی تھی۔ ایک نئے رشتے میں بندھنے کے باوجود وہ اسے قبول کرنے سے ڈر رہی تھی کیوں کہ اس نئے رشتے کے لیے اسے اپنے عزیز از جان بابا جان کو کھونا پڑتا اور یہ اسے منظور نہیں تھا مگر عمر کی "محبت" سے انکار بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا وہ بھی تب جب وہ خود بھی اپنے دل کو اسی کے لیے پر دھڑکتا محسوس کرتی تھی۔

بڑے سے لاؤنج میں اب مکمل سناٹا تھا جس میں کبھی کبھی انوشے کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ہمدان کی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔ اس کے پاس وہ لفظ نہیں تھے جس کے ذریعے وہ انوشے کے بچپن کی محرومی' تنہائی اور اکیلے پن کا مداوا کر سکے۔ ہمدان نے ہمیشہ اپنی ماں کے منہ سے ماہ رخ کے لیے بہت اچھے کلمات سنے تھے وہ بچپن سے سنتا آ رہا تھا کہ جہانگیر ماموں بہت اکھڑ اور ضدی تھے' مگر ہمدان کو وہ صرف اصول پسند اور سنجیدہ لگتے تھے' مگر آج انوشے کی نظر سے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ جہانگیر ماموں کی انا' خود سری اور ضد نے کتنی زندگیوں کو تباہ کر دیا تھا۔ ہمدان نے گہری سانس لی اور سر جھکائے انوشے کو دیکھ کر اٹھتے بولا۔

"کاش انوشے میں تمہارے دکھ کا مداوا کر سکتا یا تمہیں خوشی دے سکتا' مگر خیر!" ہمدان نے اٹھتے ہوئے کہا اور داخلی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے جب اس نے اپنی پشت پہ انوشے کی آواز سنی تھی۔

"تم مجھے خوشی دے سکتے ہو ہمدان!" ہمدان نے مڑ کر انوشے کی طرف دیکھا تھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ہمدان زندگی میں جب محبت ہمارے دروازے پہ دستک دیتی ہے تو ہم اپنی کوتاہ نظری' کم فہمی یا اپنی ضد اور انا میں اسے نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کا احساس تب ہوتا ہے جب زندگی صحرا کی مانند بن جاتی ہے اور ہم آبلہ پا چلتے' خاک اڑاتے کسی محبت بھری ٹھنڈی چھاؤں کو ترستے ہیں۔"

انوشے نے کچھ دیر کا وقفہ لیا تو ہمدان الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں سمجھا نہیں۔" ہمدان نے پوچھا تھا۔

"ہمدان جو غلطی آج سے کئی سال پہلے بابا جان نے

کی تھی سچی محبت اور مخلص رفیق کو ٹھکرا کر وہ تم مت کرنا۔ علشبہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ بہت مخلص اور حساس ہے تمہارے لیے اس کی محبت کی قدر کرنا اور اسے سنبھال لینا ضروری نہیں کہ تمہیں زندگی بار بار یہ موقع دے گی۔ سچے اور خالص لوگ ہیرے کی مانند ہوتے ہیں جنہیں حاصل کرنے کی تمنا سب کی ہوتی ہے اور ویسے بھی مما کہتی تھیں کہ جو مرد عورت کے آنکھوں سے بہتے آنسوؤں پہ تڑپ جائے وہ عورت اس مرد کے لیے بہت خاص ہوتی ہے جسے اپنی زندگی میں دانستہ طور پر تو وہ کبھی دکھ نہیں دے گا اور علشبہ کی آنکھوں میں آنسو تم بھی نہیں دیکھ سکتے ہو۔"

انوشے نے اسے بیتی ہوئی ایک رات کا حوالہ دیا تھا جب علشبہ کو روتے ہوئے دیکھ کر ہمدان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ہمدان نے خاموشی سے انوشے کو دیکھا تھا پھر ایک نرم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ پھیل گئی تھی۔ ہمدان نے اثبات میں سر ہلایا اور چلا گیا۔ انوشے نے آسودگی سے گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

☆ ☆ ☆
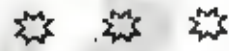
بابا جان تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ گئے تھے۔ ہمدان اور انوشے نہیں جانتے تھے کہ بابا جان بھی سب سن چکے تھے۔ بابا جان کمرے میں آئے تو ان کا فون بج رہا تھا۔ اسکرین پہ جگمگاتا نمبر دیکھ کر ان کی تیوری چڑھ گئی تھی۔

"ہیلو...!" بابا جان کی بارعب آواز میں سرد مہری کا عنصر واضح تھا۔

"بس کرو جہانگیر! اب تک تم اپنی ضد اور انا کے لیے دوسروں کے دل اجاڑتے رہو گے۔" دوسری طرف سے احسن نے غصے سے کہا تھا۔ عمر کے ذریعے انہیں اطلاع مل چکی تھی کہ بابا جان انوشے سے سخت ناراض اور خفا ہیں۔ انوشے نے فون کر کے عمر کو اس دن سب بتا دیا تھا اور اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے زور دیا تھا۔ تب ہی عمر نے باپ کو فون کر کے فوراً پاکستان آنے کو کہا تھا تاکہ وہ بابا جان سے بات کر کے مسئلے کا حل نکال سکیں۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" بابا جان نے اسی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"سنو جہانگیر! تم نے اپنی ضد اور تنگ نظری کی وجہ سے میری بہن کی زندگی تو خراب کر دی تھی میں اس وقت بھی مجبور تھا کیوں کہ ماہ رخ ایسا نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں کچھ بھی کہا جائے، مگر میں تمہیں تاریخ کو دہرانے نہیں دوں گا۔ تمہاری وجہ سے انوشے نے اپنی ماں کی آخری خواہش اور دل کی خوشی کو پس پشت ڈال کر عمر سے طلاق کا مطالبہ کیا ہے جبکہ وہ دل سے ایسا نہیں چاہتی ہے اور تم کیسے باپ ہو؟ جو اپنی بیٹی کے دل کا حال نہیں سمجھتے ہو؟ اسے دکھ دینا چاہتے ہو! تم کیسے انسان ہو؟ جس پہ کوئی رشتہ، کوئی جذبہ، کوئی لفظ اثر نہیں کرتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم تم ماہ رخ کی آخری کال کا ہی احترام کر لیتے۔"

احسن نے جھجکتے لہجے میں کہا تو بابا جان ایک دم ہی چونک گئے اور ہکلاتے ہوئے بولے۔

"کیا تم جانتے ہو کہ...؟"

"ہاں! اس لیے کہ ماہ رخ نے جب تمہیں کال کی تھی تو میں اس کے پاس ہی تھا، مگر میں نے انوشے سے یا کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ تمہاری اور ماہ رخ کی بات ہوئی تھی۔"

احسن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو بابا جان نے اپنے ماتھے پہ چمکتا پسینہ صاف کیا تھا وہ آج تک یہ ہی سمجھتے رہے تھے کہ ان کی اور ماہ رخ کی آخری وقت ہوئی گفتگو کے بارے میں کوئی نہیں جانتا ہے۔

"میں پاکستان آرہا ہوں انوشے کو رخصت کروانے۔"

احسن نے فون بند کرنے سے پہلے کہا تھا۔ بابا جان نے تھکے ہاتھوں سے موبائل سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عمر بیڈ پہ نیم دراز موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسکرین پہ انوشے کا چہرہ روشن تھا۔ یہ اس دن کی تصویر تھی جس دن دونوں نکاح جیسے مضبوط بندھن میں بندھے تھے۔ اس کی جھکی آنکھیں اور چہرے کی اداسی نہیں حیرانی نمایاں تھی۔ یہ سب تصویریں شہرام نے کھینچی تھیں۔ کچھ تصویروں میں عمر اور انوشے بھی ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تصویر اس دن کی بھی تھی جس دن انوشے اور عمر ریسٹورنٹ میں ملے تھے۔ نک سک سے تیار، کچھ شرمائی اور گھبرائی ہوئی سی، وہ دل میں اتر جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

پاکستان آنے کے بعد وہ صرف ایک بار ہی انوشے سے مل سکا تھا، مگر فون پہ اس کا رابطہ تھا انوشے سے اور انوشے کی زبانی ہی سب حالات جان کر اس نے اپنے باپ کو فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ سب پاکستان آ رہے تھے۔ ان کا ارادہ انوشے کو رخصت کروا کر ہی واپس لے کر جانے کا تھا۔ عمر چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا، مگر اس کے نزدیک انوشے کی خوشی اور رضامندی بھی ضروری تھی۔ اس دن ملنے پر عمر کو اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ محبت کے سفر میں وہ اکیلا نہیں ہے انوشے بھی اس کی ہم قدم ہے، مگر اس کے سامنے تسلیم کرنے سے ہچکچا رہی تھی، مگر بچھڑنے یا چھوڑنے کے سوال پر اس کے جملوں میں بے ربطی اور لہجے میں لرزش واضح تھی۔ ایک طرف وہ عمر کو چھوڑنے کی بات بھی کرتی تھی اور دوسری طرف آنسو بہانے، درد سنانے کے لیے بھی اسی کا کندھا درکار ہوتا تھا۔ ایک تصویر میں وہ اپنی گہری سبز ساحر آنکھوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں کیسا طلسم تھا کہ عمر خود کو مکمل طور پر بے بس اور مجبور پاتا تھا۔ ایک حصار سا اس کے گرد کھینچ دیتی تھیں یہ ساحر آنکھیں۔

میرے ساحر سے کہہ دینا
کہ
اس کے عشق کے طلسم سے،
اب تک وہ نہیں نکلے۔
کہ
جن کو اس کی آنکھوں نے،
فقط ایک بار دیکھا تھا...!

☼ ☼ ☼

"بابا جان!" جہانگیر نے اپنی پشت سے انوشے کی مدھم آواز سنی تو ان کے ہاتھ جہاں تھے وہاں ہی رک گئے تھے۔ بالکل ایسے ہی ان کے اندر اٹھا بھونچال تھم گیا تھا۔ ساکت ہو گیا تھا۔ انوشے کے لہجے میں کرب تھا اس کی پکار میں کیا تھا بابا جان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا الماری کی پٹ پہ ان کے دونوں ہاتھ جمے ہوئے تھے ان کا سارا وجود کان بن گیا تھا۔ صرف انوشے کی آواز سننے کے لیے! پھر بابا جان نے اپنی پشت پہ انوشے کا لمس محسوس کیا۔ ان کا وجود پتھر سے موم بننے لگا تھا۔ وہ ایسا پتھر تھا جس کی جان جس کی زندگی انوشے میں تھی۔ انوشے نے اپنا سر ان کی پشت سے اٹکا دیا تھا۔

"بابا جان! آپ جانتے ہیں جتنا شور ہم دنیا کو یہ دکھانے کے لیے کرتے ہیں کہ ہم کتنے مضبوط اور بہادر ہیں۔ اس سے کئی زیادہ خاموشی سے ہم ریت کی بھر بھری دیوار کی طرح اندر سے ڈھے جاتے ہیں۔ اور اسی سکوت، بھید بھری خاموشی میں ہم خود سے بچھڑے، زندگی کی شاخ سے ٹوٹے ہر رشتے کی قبر پہ، برسوں یادوں کے کتنے ہی دیے جلاتے ہیں، مگر پھر بھی ہمارے اندر کی تنہائی، اندھیرا، اکیلا پن ختم نہیں ہوتا ہے۔"

انوشے کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ان کی پشت کو گیلا کر رہے تھے۔ جہانگیر علی کی سنگلاخ پتھر جیسی آنکھوں میں بھی نمی پھیلنے لگی تھی۔ ان کی انا، غرور کے بت میں پہلے ہی دراڑیں پڑ چکی تھیں یہ ان کی آخری کوشش تھی خود کو مضبوط ثابت کرنے کی، مگر وہ بھول گئے تھے اس بار ان کے سامنے ان کی "محبت"

نہیں بلکہ ان کی "زندگی" ٹھہری ہوئی تھی۔ بہت سال پہلے کسی کی "محبت" سے تو بظاہر منکر بن گئے تھے مگر سانس کے چلتے ہوئے "زندگی" سے انکار کیسے ممکن تھا۔

"بابا جان آپ جانتے ہیں نا کہ مما نے ہمیشہ آپ سے اور صرف آپ سے محبت کی تھی۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک تب ہی انہوں نے دوسری شادی کے لیے کبھی ہامی نہیں بھری تھی۔"

انوشے کی سرگوشی تھی یا صور اسرافیل! ان کا سارا وجود زلزلوں کی زد میں آچکا تھا۔ ان کا بنایا مضبوط پتھر کا بت پاش پاش ہو چکا تھا۔

"اور بابا جان! آپ بھی تو ان سے اتنی ہی محبت کرتے تھے' مگر خود سے 'اعتراف کرنے سے کتراتے رہے ہمیشہ..... مگر محبت کب لفظوں کے سہاروں کی محتاج ہے۔ جب جب میں مما کا ذکر کرتی تھی یا کوئی ان کا نام لیتا تھا آپ کے چہرے کی چمک' آنکھوں میں بڑھتا اشتیاق اور درد آپ کے دل کا ترجمان تھا۔ محبت نے تب آپ پہ اپنا آپ ظاہر کیا جب آپ اسے ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے۔"

انوشے کے الفاظ ایسے تازیانے تھے جن سے ان کے زخم ادھڑنے لگے تھے۔ انوشے کیسے ان کے دل کے سب رازوں کو جان چکی تھی جس کا اعتراف کبھی انہوں نے خود سے بھی نہیں کیا تھا۔ بابا جان کے الماری کے پٹ پہ رکھے ہاتھوں کی گرفت اتنا سخت ہوئی کہ رگیں ابھر آئی تھیں۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچے انہوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں' مگر یہ ان کے کڑے ضبط کو ظاہر کر رہے تھے ان کی حالت سے بے خبر انوشے بول رہی تھی۔

"پہلے مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی' مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے دیکھا' جانچا کہ آپ دونوں ایک دوسرے سے دور ہونے کے باوجود' ایک دوسرے سے الگ ہو جانے کے باوجود' کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہیں بولتے تھے۔ مما ہمیشہ آپ کے اچھے پہلو پہ بات کرتی تھیں اور آپ ہمیشہ مجھے کہتے تھے کہ مجھے بھی اپنی مما کی طرح بننا ہے۔ آپ دونوں کی باتوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور احساس ہوتا تھا۔ مما کے پاس جاتی تو وہ بہت دلچسپی اور اشتیاق سے آپ کی باتیں سنتیں' مجھے آپ کی پسند ناپسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی اس سے بڑی قربانی یا محبت کی مثال کیا ہوگی کہ حق رکھتے ہوئے بھی مما نے میری کسٹڈی کے لیے کیس دائر نہیں کیا تھا بلکہ اپنی رضا اور خوشی سے مجھے آپ کے حوالے کردیا تھا۔ جانتے ہیں کیوں بابا جان!"

انوشے نے ہر راز پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اس لیے کہ وہ آپ سے اتنی شدید محبت کرتی تھیں کہ آپ کو اپنی ہی ضد' تنہائی کے ساتھ تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ وہ خود نہ سہی' مگر اپنا عکس میری شکل میں آپ کے لیے چھوڑ گئی تھیں۔"

انوشے کی بات سن کر انہیں ماہ رخ کی حویلی میں وہ آخری رات یاد آئی تھی جب انوشے کو ان کے پاس چھوڑ کر جاتے ہوئے ماہ رخ نے کہا تھا کہ "کچھ سوالوں کے جواب وقت دیتا ہے۔!" اور وقت نے پھر یہ ثابت کیا تھا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی عمر کی سیڑھیاں چڑھتے زینہ بہ زینہ' جہانگیر کو ماہ رخ کی محبت کے ایسے ایسے رنگ نظر آئے کہ دنگ رہ گئے۔ ماہ رخ کتنی مخلص اور عظیم عورت تھی اس کا اندازہ' جہانگیر علی کو تب ہوا جب وہ اسے گنوا چکے تھے۔

انوشے ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ انوشے کی آنکھوں کے سامنے اپنے والدین کی بے رنگ اور ادھوری زندگی کے کتنے ہی لمحے تھے' پل تھے جو گھوم رہے تھے۔ اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"اور بابا جان! آپ نے اپنے اوپر ایک سخت اور بے حس شخص کا خول چڑھا لیا' صرف دنیا کو یہ دکھانے اور بتانے کے لیے کہ آپ کتنے مضبوط ہیں' آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا کسی کے آنے یا جانے سے' آپ نے بظاہر مما سے وابستہ ہر چیز' ہر نشانی ہر یاد کو مٹا دیا تھا مگر اپنے دل سے کبھی نہ نکال سکے یا آپ سچ میں اپنے دل

سے اتنے انجان رہے ساری عمر! بولیں بابا جان!"

انوشے کے پکارنے پر بھی جب کوئی جواب نہیں آیا تو انوشے نے اپنا سر اٹھایا اور اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتی مضبوط لہجے میں بولی۔

"بابا جان! مما نے میرا اور عمر کا نکاح اس مان اور یقین سے کروایا تھا کہ میری رخصتی آپ کی دعاؤں کے سائے میں ہی ہوگی۔ یہ ان کا آپ پر یقین اور اعتماد تھا' اگر یہ سب ان کا وہم تھا تو آپ حکم کریں میں ہمیشہ کے لیے عمر سے ہر تعلق ختم کردوں گی مگر میں آپ کو اس طرح تکلیف میں اور ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"

انوشے نے امید بھری نظروں سے بابا جان کو دیکھا تھا' مگر ان کی طرف سے ہنوز خاموشی پاکر انوشے کے لبوں پہ افسردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ کی خاموشی ثابت کررہی ہے کہ مما کا یقین غلط نہیں تھا۔ وہ آپ کو آپ سے بہتر جانتی تھیں مگر۔۔۔"

انوشے نے گہری سانس لی اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔ دروازے کی طرف جاتی اس کی نظر نیچے قالین پہ بکھری چیزوں پہ پڑی تو اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔

"بابا جان! آپ چیزیں توڑ سکتے ہیں' جلا سکتے ہیں' آپ ہر نشانی مٹا سکتے ہیں' مگر آپ "یادیں" نہیں مٹا سکتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو ذرا اپنے دل میں جھانک کر دیکھ لیں۔"

انوشے نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ بری طرح روتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ اس کے جاتے ہی بت بنے بابا جان' بھربھری مٹی کی طرح نیچے بیٹھتے گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ٹوٹ رہے تھے' بکھر رہے تھے اور انہیں سمیٹنے والا کوئی نہیں تھا اور یہ انتخاب انہوں نے زندگی میں خود کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شدید دھند کے باعث فلائٹس کی ٹائمنگ تبدیل ہوچکی تھیں' وہ لوگ پچھلے چار گھنٹے سے ایئرپورٹ پہ موجود تھے۔ عمر نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئیں ماما جان اور شہرام کی طرف دیکھا تھا۔ ماما جان شہرام کی کسی بات کا جواب دیتی' مسکرا رہی تھیں۔ عمر نے گردن گھما کر ڈیڈ کو دیکھا۔ اسی وقت انہوں نے بھی عمر کی طرف دیکھا تھا اور اسے دور سے اشارہ کرتے اپنے پاس ہاتھ ہلا کر بلانے لگے۔ عمر اٹھ کر ان کی طرف چل پڑا۔

"پری کافی ڈسٹرب اور اداس ہے۔ تم سنبھالو اسے۔" عمر کے پاس پہنچتے انہوں نے سرگوشی بھرے انداز میں کہا اور عمر کے اثبات میں سرہلانے پر اس کا کندھا تھپتھپا کر ماما جان اور شہرام کی طرف بڑھ گئے۔ عمر خاموشی سے انوشے کے پاس آکھڑا ہوا۔ جو بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ ایئرپورٹ کے داخلی حصے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"انوشے!" عمر نے پاس آکر نرمی سے پکارا تھا۔ تو انوشے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"عمر بابا جان۔۔۔!" انوشے نے سسکی بھری تھی۔

"ڈونٹ وری انوشے! بابا جان ضرور۔۔۔" اس سے پہلے کہ عمر کی بات مکمل ہوتی اسی وقت' سر پہ کیپ اور لانگ کوٹ پہنے کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے پاس آرکا۔

"بابا جان!" انوشے بے ساختہ خوشی سے چیختی ان کے گلے لگ گئی تھی۔ بابا جان نے انوشے کا ماتھا چوم کر "سدا خوش رہو" کی دعا دی تھی۔ عمر بھی آگے بڑھ کر ان سے ملا تھا۔ بابا جان کو دیکھ کر احسن بھی اٹھ کر آگئے تھے۔ اور مسکرا کر ہاتھ ملا کر حال احوال پوچھنے لگے تھے۔

بابا جان کے چہرے پہ بہت نرم سے مسکراہٹ تھی۔ انوشے ہلکے سے میک اپ اور ہاتھوں پہ لگی پندرہ دن پہلے کی مٹی مٹی سے مہندی کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ نئی زندگی کی خوشیوں اور عمر کی محبت اور ہمراہی کے رنگ بہت واضح تھے۔ بابا جان کا دل اطمینان سے بھر گیا تھا۔ انہیں اپنے فیصلے کی درستی کا یقین ہونے لگا تھا۔

انوشے کی اس دن کی باتوں اور بے تحاشا رونے سے بابا جان کی انا کا بت چکنا چور ہو کر رہ گیا تھا اور اسی لیے

احسن کے ہمراہ فیملی پاکستان آتے اور بابا جان سے ملتے ہی انہوں نے رخصتی کی تاریخ دے دی تھی۔
تھوڑے دن میں بھی ہر کام ' ہر تیاری بہت جوش و خروش سے کی گئی تھی۔ علشبہ' انوشے کی دونوں پھوپھیاں' ہمدان اور باقی خاندان کے قریبی لوگ ہر کام میں پیش پیش تھے۔ ہمدان اور علشبہ کی بات بھی طے ہو گئی تھی۔ اس لیے علشبہ کی شوخیاں اور چہکار اپنے عروج پر تھیں۔ انوشے کی شادی روایتی دھوم دھام سے ہوئی۔ دونوں طرف سے کوئی کمی نہیں رکھی گئی تھی اور ماہ رخ کے وعدے کے مطابق ہی انوشے بابا جان کی دعاؤں تلے رخصت ہوئی تھی۔ انوشے کو رخصت کرتے وقت بابا جان نے جانا تھا کہ بیٹی کی جدائی کیا چیز ہوتی ہے اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔
آج شادی کے پندرہ دن بعد وہ سب واپس کینیڈا جا رہے تھے اور آج ہی صحیح معنوں میں انوشے اور بابا جان ایک دوسرے سے دور ہو رہے تھے جہاں ایک نئی زندگی کے شروع ہونے کی خوشی بھی تھی وہاں بابا جان سے دوری کا دکھ بھی تھا۔ جب تک فلائٹ کی اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی انوشے بابا جان کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی۔ بابا جان کی فکر مندی میں کتنی ہی ہدایتیں انہیں کرتی رہی تھی۔ جسے بابا جان اور عمر مسکرا کر سنتے رہے۔
"جاؤ میرے بچوں! اللہ کی امان میں! زندگی نے وفا کی تو ایک بار تو ضرور اپنی انوشے سے ملنے اس کے گھر آؤں گا۔"
بابا جان نے مسکراتے ہوئے کہا تو انوشے جھینپ گئی۔ یک بار حیا کی لالی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ جسے عمر نے بہت دلچسپی سے دیکھا تھا۔ انوشے جاتے ہوئے بھی بار بار پیچھے مڑ کر بابا جان کو دیکھ رہی تھی۔ جن کے ہونٹوں پہ تو مسکراہٹ' مگر آنکھوں میں نمی تھی۔
کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے جگر کے گوشے کو خود سے دور کرنا اور دوسروں کے ہاتھوں میں سونپ دینا' مگر دنیا کی یہ ہی ریت ہے۔ آج بابا جان کو بے اختیار وہ وقت یاد آیا جب وہ ماہ رخ کو میکے جانے نہیں دیتے تھے۔ روکتے ٹوکتے تھے۔ کبھی اس بات کا احساس نہیں کیا تھا کہ ماہ رخ اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ان کا دل کتنا تڑپتا ہو گا اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے' مگر جہانگیر کے مزاج کو دیکھ کر چپ کر جاتی تھیں۔
"ایسا کیوں ہوا ہے کہ کسی کی تکلیف یا دکھ کا احساس تب ہوتا ہے جب ہم خود اس کی کیفیت یا حالات سے گزرتے ہیں۔"
بابا جان شکستہ قدموں سے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلے تھے۔ شدید دھند میں اپنے لانگ کورٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے انہوں نے مڑ کر دھند میں جگمگاتی ایئرپورٹ کی لائٹس کو دیکھا تھا۔ ایک افسردہ سی مسکراہٹ نے انہوں کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔
"نظر کی دھند کے پیچھے کہیں گھپ اندھیروں میں ڈوبے' رشتوں کی قبروں پہ' یاد کے کبھی مدھم اور کبھی روشن دیے ایسے ہی ٹمٹماتے ہیں۔ اپنے ہونے کا احساس ہمیشہ دلاتے ہی رہتے ہیں۔ چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں' مگر یادیں کبھی مٹتی نہیں ہیں۔"
جہانگیر علی شاہ نے بھی یہ بات اس دن تسلیم کر لی تھی۔ خود سے بھاگنے والے' زیادہ دور نہیں جا سکتے ہیں۔ جہانگیر علی شاہ بھی واپس پلٹ چکے تھے' احتساب کے لیے! رشتوں کی قبروں پہ یاد کے روشن دیے جلانے کے لیے۔

ساتھ لاتی ہے ایک ایک منظر
یاد کچھ بھول کے نہیں آتی!

✿ ✿ ✿

اور احتساب کرنے کا عمل اسی دن شروع ہو گیا تھا جس دن مرنے سے دو دن پہلے ماہ رخ نے اسپتال کے بستر پہ لیٹے' جہانگیر علی شاہ کو کال کی تھی۔ یہ بات ان کے اور ماہ رخ کے علاوہ صرف احسن جانتے تھے۔ جو اس وقت ماہ رخ کے پاس ہی موجود تھے۔ جہانگیر علی شاہ کی سماعتوں میں وہ آواز اپنے ہر لفظ کے ساتھ ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔

"جہانگیر!" فون سے ابھرتی اس آواز کو اس زبان سے نکلے اپنے نام کو سننے کی چاہ کتنی بار ہی دل کے چور گوشے سے ابھر ابھر کر سامنے آئی تھی اور آج اتنے سالوں بعد جب اس آواز نے پکار ان کا نام لیا تو جہانگیر علی شاہ کو لگا جیسے ساری کائنات تھم گئی تھی۔

"میں نے ہماری بیٹی کے لیے اس یقین اور اعتماد سے ایک فیصلہ کیا ہے کہ جس یقین اور اعتبار کی وجہ سے میں اسے تمہارے پاس چھوڑ کر چلی آئی تھی! تم جانتے ہو نا وہ "جذبہ" کیا تھا؟" ماہ رخ کی نحیف اور رک رک کر آتی آواز جہانگیر کے دل پہ آرے چلا رہی تھی۔

"جہانگیر میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے نصیب میں بھی کوئی ایسا شخص آئے جو نازک احساسات اور جذبات سے قطعی عاری ہو۔ جو اپنی ضد' انا' خود سری' ہٹ دھرمی کے پیچھے سب تباہ کردے۔ میں نے ہماری بیٹی کے لیے ایسا شخص چنا ہے جو نازک شیشوں جیسے جذبات کی حفاظت کرنا جانتا ہے اور تم سے بہتر یہ کون جانتا ہو گا کہ ٹوٹے شیشے چننا کتنا مشکل ہوتا ہے نا! اس لیے تو تم کبھی یہ نہ کرسکے! میں نے تم سے تمہاری ہر زیادتی' ہر ظلم کے بدلے کبھی کچھ نہیں مانگا' مگر آج مانگتی ہوں' میری انوشے کو کبھی تنہا مت کرنا اسے وہ سب ضرور دینا جو اس کا حق اور تمہارا فرض ہے۔ میرے کیے گئے فیصلے کی سزا اسے مت دینا!"

یہ آخری الفاظ تھے جو جہانگیر نے سنے اور پھر ان کو سمجھنے کی کوشش میں وہ خود سے الجھنے لگے اور اس سوال کا جواب انہیں تب ملا جس دن انوشے اور عمر کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کر وہ انوشے پہ غصے ہوئے تھے اور انوشے کے منہ سے نکلے انکشاف نے انہیں حیران کردیا تھا اور اس دن جہانگیر کو ماہ رخ کے لفظوں کا مطلب سمجھ آیا تھا' مگر وہی فطری ہٹ دھرمی اور ضد جو ان کے آڑے آرہی تھی' مگر احسن کی کال اور انوشے کی باتوں نے انہیں جھکنے پر مجبور کردیا تھا۔

ماہ رخ ان کی زندگی سے کیا گئی کہ اندر' باہر ایک ویرانی ان کے اندر بس گئی تھی۔ ماہ رخ سے "محبت" کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ کسی دوسری عورت کو اپنی زندگی میں شامل کر ہی نہ سکے۔

روز آجاتا ہے وردل پہ دستک دینے
اک شخص جس کو میں نے کبھی بلایا ہی نہیں!

ایسا ہی ہوا تھا جہانگیر کے ساتھ۔

عمر کے اس آخری حصے میں' وجود کے خالی پن میں اڑتے بکھرے لمحوں کو دیکھنا اور سہنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے' مگر یہ سزا بھی انہوں نے خود چنی تھی اپنے لیے...!

زندگی خاک نہ تھی' خاک اڑاتے گزری
تجھ سے کیا کہتے تیرے پاس جو آتے گزری
دن جو گزرا تو کسی یاد کی رو پہ گزرا
شام آئی تو کوئی خواب دکھاتے گزری
رات کیا آئی کہ تنہائی کی سرگوشی میں
ہو کا عالم تھا' مگر سنتے سناتے گزری
بارہا چونک سی جاتی ہے مسافت دل کی
کس کی آواز تھی' یہ کس کو بلاتے گزری!!!

☆ ☆